

عبدالعزیز خاں

رونقِ لاہور

ضبطِ گریہ ہے سعیِ نامشکور
عینِ! جودِ بدِ مُعابِ المنزور
آ رہی ہے ندائے ویل و ثبور
آدمی۔ بے ثبات و بے مقدور
موت کے سامنے مگر مجبور
جانے کس بات کا ہے ان کو غور
ان کی دوکانِ شیشہ چکنا چور
خانہِ دیرانیوں کا کیسا مذکور
مجلسِ غمِ بنی ہے محفلِ سُور
لوئے محل ہے کہ موجبہ کا فور
کس کو رو تا ہے بلبلی ہجور
کر گیا گل چراغِ بزمِ سرور
کون کرتا ہے سرِ عدوں کو عبور
کون زیرِ زمیں ہوا مستور
نوعِ و سِ بہار ہے رنجور
جسے سمجھیں زباں شناسِ زبور
جسے لکھیں نگارِ بندِ سُور
سقا جو اصلاحِ حال پر مامور
لکھنا پڑھنا ہی جس کا تھا دستور
سقا جو تشریحِ شعر میں مشہور

سینہ پر زخم، زخمِ نامشور
کون رونے سے روکتا ہے تجھے؟
یا صبا حاک! یا صبا حاک!
آدمی۔ قادرِ علی الاطلاق
زندگی کو دکھائے شانِ کئی
بنی آدم مُسافرِ عدم
ایک ٹھوکر لگے تو چھن سے ہو
اک خرابہ ہے آرزو کا نگر
گرد آلود ہے فضا دل کی
منقلب ہے مزاجِ موسم کا
کون رخصت ہوا گلستاں سے؟
کون عیسیٰ نفس بہ جنبشِ لب
کس کے تن پر ہے طلیسانِ سفر
رنگ کیوں آسماں کا ماند ہوا؟
زرد ہیں کس کے سوگ میں پتے؟
کا ہنایِ طلسمِ لوح و قلم
سالکانِ مراحلِ معنی
زہدِ پیشہ معلّم پر فن
وکن والرا سخون فی العلم
درس و تدریس میں مثالِ اپنی

علم کے نور سے منور دل
 تھے اناث و ذکور و پیر و جوان
 اس کے ہوتے عروس و انش کی
 آخری وقت تک لٹاتا رہا
 جیت کی بجے نہ ہار کی چنتا
 وضعداری کے رنگ روپ کے ساتھ
 ہم نے دیکھا کبھی نہ اُجیانا
 وہ تو سنجیدگی کا پیکر تھا
 انقلابات کا مزاج شناس
 امتزاج تو گل و تمکین
 غم کی تاریک و تار راہوں میں
 تنقاسیہ روی شعار اس کا
 اک ادارہ تھا اپنی ذات سے وہ
 بات حب وطن کی جب بھی چلے
 اس کا ایمان محبت اُردو
 کا و کا و قلم یہ کہتی ہے
 نذر جاں دے کے اہل فکر و نظر
 اک تمیامت تھا آخری دیدار
 آنسوؤں سے لدی ہوئی پکیں
 تَدْمَعُ الْعَيْنُ، يَحْزَنُ الْقَلْبُ
 کان آواز دوست کو ترسیں
 زندگی خواب موت بیداری
 ہے عیاں راز زندگی ان پر
 خرمن سوختہ سے رزق اُگے
 جانے والا گیا مگر خالہ

شب و بجزور میں تجلی طور
 جس کے سحر خطاب سے مسحور
 مانگ میں تھا شہاگ کا سینہ دور
 دونوں ہاتھوں سے جو در منشور
 تھا جو خود دار پر نہ تھا مغرور
 مے اثبات ذات سے مخمور
 اس کے چہرے پہ سرخوشی کا وفور
 بے ریا، با اصول، سادہ غفور
 واقف گردش سین و شہوہ
 راحت و رنج میں صبور و شکور
 تھی رفیق اس کی ہمت موفور
 عجلت و اشتعال سے تھا نفور
 داعی و ساعی فروغ شعور
 آئے گا اس کا ذکر خیر ضرور
 جس کا ہوتا طرح طرح سے ظہور
 ہے سہرور بھی بندہ مزدور
 کریں زندہ روایت منصور
 جوش پر تھی طبیعت مجرور
 جیسے برسات کی گھٹا گھنٹھور
 ہم ہیں اخفائے حال سے مخدور
 اب جگائے گا اس کو نفع شور
 صادق آئے مثال سایہ و نور
 زندوں سے زندہ تر ہیں اہل قبور
 شب پیدا سے پھوٹے صبح نشور
 لے گیا ساتھ رونق لاہور

ہو خدا اس کا حافظ و ناصر
 رہ اندھیری ہے اور منزل دور

عظیم قریشی

عبقری کی موت !

بزرگ عظیم کے ممتاز ماہر تعلیم، دانشور قوم و ملت، یگانہ روزگار محقق و ادیب
پروفیسر حمید احمد خان کی بے وقت اور اچانک موت سے متاثر ہو کر !

ایک شعلہ جھپکا
بجھ کے یہ کہہ گیا

خبر کا شہستان فقط موت ہے
خودی کی نگہیاں فقط موت ہے

ایک نغمہ مٹا
مٹ کے یہ کہہ گیا

ہوئی موت مومن یہ یکسر حرام
نبیؐ نے کہا جن پہ لاکھوں سلام

ایک تار اگر گرا
گر کے یہ کہہ گیا

خدا کا بھی میہماں بنا ہے حمید
محمدؐ کا درباں بنا ہے حمید

غلام رسول ازہر

بیاد حمید احمد خاں

جذب سے جس کے مہر و ماہ اسیر
علم کا ایک بحر بے پایاں
شاخ در شاخ پھوٹے ہی رہتے
تھا جو غو غبار، آہ سوزاں سے
عشق کی آگ سے خمیر اٹھا
شعلہ عشق، دم بدم روشن
علم و عرفاں کا بول بالا تھا
وہ جو صدق و صفا کا مظہر تھا
جس کی نیکی کا کچھ حساب نہ تھا
ایک عالم کی دستگیر کی
بے عصا تھا مگر کلیم تھا وہ
کاہش جہاں سے آبپاری کی
ساری دنیا کا غم جو کھاتا تھا
جس کے قصے زباں پہ جاری ہیں
جس سے سیراب ان گنت انسان
گو یا حسن عمل کا آئینہ
اپنے قلب و نظر کو پالا تھا
بس گیا دل میں بے گماں ازہر
جس نے ہم سب کو یاں سنوارا تھا
بے ریا، سچی بات کرتا تھا

وہ خودی کا نقیب، مرد فقیر
وہ جنوں خیزوں میں سیل رواں
عمر بھر جس سے علم کے سوتے
تھا جو پڑ سوز آتش جاں سے
جس کا لاریب، ازہر حسنہ،
نازش رنگ و رامش گلشن
جس سے گھر گھر یہاں اُجالا تھا
وہ جو مہر و وفا کا محور تھا
جس کے اخلاق کا جواب نہ تھا
فقر میں جس نے یاں امیری کی
ایک درویش بے گیم تھا وہ
ضرب شیشہ سے سینہ کاری کی
دکھ کہیں ہو، تڑپ سا جاتا تھا
جس کے الطاف یاد گاری ہیں
فیض کا ایک چشمہ جیواں
بزم ہستی میں ہم عمل جس کا
اپنی سیرت کو جس نے ڈھالا تھا
نور محبوب حق پہ یاں ازہر
ہم فقیروں کا جو سہارا تھا
مو منانہ صفات رکھتا تھا

حق و انصاف جس کا ایمان تھا
جس کا دل تھا زباں کا سر پایا
جس کے دل سے زباں کی یاری تھی
عمر بھر جس نے حق بیانی کی
ہر نفس جو خودی کا حافظ تھا
علم پرور، عمل کا پیکر تھا
بام انسانیت کا زینہ تھا
جس کو انسان کی تلاش رہی
جستجو میں رواں دواں پیہم
وہ شب و روز کا مسافر تھا
اپنی منزل سے بہرہ ور تھا وہ
وہ معلم کہ کیمیا گر تھا
جس کے چھوٹے سے زندگی پہنچے
حافظِ حرمتِ قلم تھا وہ
پاک ہیں، پاک نفس، پاک ضمیر
رو برو اس کے بے نقاب سی تھی
خوش نفس ایسا مرد سیرت ساز
بیلا شوق سے دنیاویوں کی
محرم ذات تھا، قلندر تھا،
ایک مجذوبِ عشق پیشہ تھا
ساک راہ و رسم راز و نیاز
مہرِ نوز تھا، مسرتا باں
جس نے خدا کس سے خوف کھاتا تھا
اسل میں دُرِ ناب تھا ازہر
روحِ غالب سے فیضیاب تھا وہ

تھا یہ مضراب پر دہ جاں کا
نہ کبھی اُن میں فاصلہ پایا
اس لیے بات اُس کی پیاری تھی
جس نے اس طور زندگی کی
دیدہ و دل کا جو محافظ تھا
جو فقط خوبیوں کا منظر تھا
جس کو جینے کا یاں قرینہ تھا
آرزو اُس کی، جی کے پاس رہی
شہسوارِ زماں، مکاں پیہم
گامزن راہِ عشق پر تنہا
ایک انسان دیدہ و رتھا وہ
ایک انسان گر، نواگر تھا
نور افروز، کُنڈلی گنے
ایک درویشِ خوش رقم تھا وہ
جس کے حلقہ میں کائنات اسیر
زندگی اک کھلی کتاب سی تھی
زندگی جس کو آپ دے آواز
راہ میں اُس کی جان تک چ دی
ہفت اقلیم کا سکندر تھا
جو تہور میں شیر بیشہ تھا
ظہمتِ شب میں مونس و دم ساز
مرد کا مل، حمید احمد خاں
اس کو دینا کبھی نہ آتا تھا
مرد مومن کا خواب تھا ازہر
فکرِ اقبال کا جواب تھا وہ

اُڑ گیا آخر شش مرا شہباز
کر گیا سوئے آسمان پرواز

طاہر شادانی

آہ! پیرو فیسرحمد احمد خاں

پھر آج شہرِ تمنا پہ غم کی یورش ہے
یہ آج کون ہوا رہ سپارِ ملکِ عدم
اٹھا ہے بزمِ وطن سے یہ کون فخرِ زماں
فغاں بہ لب ہے فضا، کائنات گریہ گناں

یہ کس کی موت نے چھینا دل و نظر کا سکون
نہ جانے خون ہوا کتنی آرزوؤں کا
ہر آنکھ روتی ہے، ہر دل ہے سوگوار یہاں
اکٹھے ہیں آہ! جہاں سے حمید احمد خاں

بپا ہے محشرِ شیون فضا کے گلشن میں
جو کانِ فضل و ہنر کا تھا گوہرِ یکتا
کہ آج "شیوہ اہلِ نظر" کا ماتم ہے
وطن میں آج اک ایسے بشر کا ماتم ہے

عروسِ علم کا اُس نے سہاگ لٹا ہے
رُکے گا کیسے یہ طوفاں سرِ شکِ خونیں کا
جفا طرازی چرخِ ستم شعار نہ پوچھ
تھے گی کب، مرے اشکوں کی جو تبار نہ پوچھ

لنڈھلے بادِ عرفاں کے جامِ جس نے سدا
وہ تھا جو مشرق و مغرب کا امتزاجِ حسیں
وہ میرِ میسکہ فکر و فن کہاں ہے آج
وہ اپنی ذات میں اک انجمن کہاں ہے آج

وہ جس کی ذات تھی اک موجِ نسیم بہار
وہ علم و فضل کا تھا ایک ابرِ گوہرِ بار
گھٹلائے حکمت و دانش کے پھول جس نے سدا
دلوں پہ نقش رہے گا ہمیشہ نام اُس کا

کبھی جھکی نہ سیاست کے در پہ جس کی جبین
چلا گیا ہے دریغاً، وہ آج زیرِ زمیں

جو پاسبان تھا زبان و قلم کی عصمت کا
وہ تھا جو عظمتِ اخلاق کا حیس پیکر

وقارِ اہل نظر، آبروئے دیدہ دریاں
خزینہ حکمت و دانش کا عبقری زماں

وہ جانِ صدق و صفا، منبعِ خلوص و وفا
وہ ایک صاحبِ ایمان، عظیم دانشور

و فو رسوزِ محبت سے تھا جو شعلہ بجاں
تھا جس کے سینے میں انسانیت کا دردِ نہاں
نہاں گلشنِ حکمت کے ہیں گلِ خنداں
مگر نہیں کوئی ان میں حمید احمد خاں

وہ ایک پیکرِ رعنا تھا وضعداری کا
ادا شناس مروت تھی جس کی خوئے کرم
یہاں ابھی ہیں بہت صاحبانِ فضل و کمال
ادیبِ نکتہ و رواہلِ نقد ہیں لاکھوں

خلوصِ قلب و نظر کا خراج پیش کریں
جو پیش کرنے سکے کل، وہ آج پیش کریں

چلو ندیم! کہ اس بار گاہِ عظمت میں
لحدِ پہ اُس کی، عقیدت کے پھول لے کے چلیں

سلام اُس پہ، مری آہِ نیم شب کا سلام
سلام اُس پہ مری شوقِ جاں بلب کا سلام

سلام پہنچے، مرے دیدہ ہائے تر کا اُسے
سلام اس پہ مرے جذبہٴ محبت کا

دعا ہے طاہرنا شاد کی خدا کے حضور
ملائے اعلیٰ میں پائے وہ اک مقامِ حسین
جو ارِ رحمتِ حق میں اُسے ملے مامن
ہو اس کی روح کا مسکن بہارِ خلدِ بریں



سیف نیاں

پروفیسر حمید احمد خاں

آج اُن کی موت پر ہیں سیکڑوں داغ داغ
 روشنی جن کی جہاں میں زندہ جاوید ہے
 عظمتیں تقسیم جو کرتے رہے اتنے عظیم
 زندگی بھر خدمت انسان میں کرتے رہے
 اپنے طلبہ کو سکھاتے تھے تمیز دل نشیں
 جن کے دل میں احترام قائدِ اعظم بھی تھا
 جن کی محفل میں نظامی، راشد و تاثیر کے
 آج وہ اجر انہیں آنکھوں سے اوجھل گیا
 آج وہ بھی الاماں! یادوں کی زینت ہو گئے

زندگی کو روشنی دیتا رہا جن کا داغ
 موت کی آندھی نے ایسے بھی کجھائے ہیں چراغ
 جوئے آفاق ہستی کا لگاتے تھے سراغ
 اک مئے تنویر سے لبریز ہستی کا ایاغ
 جرأتِ شاہیں ہے کیا کیا ہے یہاں مکارِ زراغ
 جن کی محفل میں جلے اقبال و غالب کے چراغ
 ظلمتِ ادراک میں روشن تھے جد کے چراغ
 اس صدی میں لہلہا یا تھا ثمر اور جو باغ
 جن کے دم سے تھے سکفتمِ زندگی کے باغ و سراغ

ہے دعا اُن کی لحد پر رحمتیں نازل ہیں
 جنت الفردوس کی سب نعمتیں حاصل ہیں

ڈاکٹر سید عبداللہ

حمید احمد خاں - ذوق و شوق کا پیکر

حمید احمد خاں ذوق و شوق کے پیکر تھے۔ اردو تحریک کے سلسلے میں میرا ان کا طویل رابطہ رہا۔ لیکن وہ صرف مجاہدِ اردو نہ تھے، ایک بلند پایہ ادیب، مشفق، مگر ضابطہ پسند استاد اور نامور محقق بھی تھے۔

اس مختصر تحریر میں ان کے علمی و ادبی کاموں کی تفصیل مشکل ہے میں صرف یہ بتانا چاہوں گا کہ خود میں نے حمید احمد خاں سے کیا سیکھا، ان سے کیا پایا؟ اس موضوع پر طویل تحریر لکھی جاسکتی ہے۔ لیکن میں اس موقع پر صرف چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

یہ معلوم ہے کہ اکتسابات کی کہانی بڑی دلچسپ اور نتیجہ خیز موتی ہے۔ انسان اپنی زندگی میں بے شمار سرچشموں سے سیراب و فیض یاب ہوتا ہے، ان میں سے بعض اثرات تعمیری بھی ہوں تو گریز پا ہوتے ہیں، مگر بعض ایسے ہوتے ہیں جو دیر پا اور مستقل ہوتے ہیں اور اکتساب کرنے والے کے ان خیالات و تصورات کا ناگزیر جز بن جاتے ہیں جنہیں وہ حاصلِ عمر سمجھ کر ان پر اپنی شخصیت کی مہر لگاتا ہے۔

ہر دوسرے شخص کی طرح میرے اکتساب و استفادہ کی بھی ایک رواد ہے، جس میں درجنوں مشاہیر و اکابر ادب کے افادات شامل ہیں۔

اس مختصر سندرے میں پروفیسر حمید احمد خاں کو جن عطیات کا میں ذکر کر رہا ہوں انہیں میں منتقل اور دیر پا فیوض کے زمرے میں رکھتا ہوں۔ اس سلسلے میں دو تین مثالیں دے رہا ہوں۔

میں جس زمانے میں اردو غزل پر درس دیا کرتا تھا۔ مجھے صنفِ غزل کے معقول فنی تجربے کی جستجو ہوئی۔ کلیم الدین احمد غزل کو نیم وحشی صنفِ ادب کہہ چکے تھے۔ اور یوسف حسین خان کی روحِ غزل اور ڈاکٹر عبادت کی کتاب ابھی منظرِ عام پر نہ آئی تھی۔ غزل کے متعلق ہمارے تنقیدی ادب کا عام فیصلہ یہی تھا کہ یہ ایک بیکار صنف ہے۔۔۔ اور مولانا حالی کے تتبع میں غزل کی جمالیاتی معنویت سے زیادہ اس کی اجتماعی و اخلاقی افادیت پر زور دیا جاتا تھا۔۔۔ نظم بڑی گھن گرج کے ساتھ آچکی تھی اور ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اب غزل کا دم واپس ہے، کیونکہ اس استفادے میں غزل کا وکیل صفائی کوئی نہ تھا۔ غزل کی اس مخالفت بلکہ اس کے خلاف شدید تعصب کے زمانے میں مجھے غزل پر ایک ایسا مضمون مل گیا جس میں جمالیاتی اصولوں اور ادب کے معقول معیاروں کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ یہ صنف نہ صرف یہ کہ اپنا جواز رکھتی ہے، بلکہ

ایک مخصوص تہذیب کی نمائندگی بھی کرتی ہے جس کی پردہ دار قضاے اسے رمزدایا کا لباس عطا کیا ہے اور جس کی علامتوں سے وضع داری اور تمکین کی قبا پہنا رکھی ہے۔۔۔۔۔ یہ مضمون حمید احمد خان کا تھا۔ میں اس سے چند سال قبل ہمالیوں میں محمد حسین ادیب کا ایک محققانہ مضمون اردو شاعری میں عشق و محبت کے مضامین کے بارے میں پڑھ چکا تھا اس سے بھی متاثر ہوا تھا، مگر اس کی حد اثر صرف یہ تھی کہ اس سے صرف مولانا حاتی کے خیالات کی تردید ہوتی تھی اس سے زیادہ اس میں کچھ نہ تھا۔ ان حالات میں غزل کے لیے مثبت انداز میں جس شخص نے پہلی مرتبہ مقدمہ لڑا وہ حمید احمد خان تھا۔

اس مضمون کے بعد یوسف حسین خان، محمد حسن عسکری، مجنوں گورکھ پوری اسلوب احمد انصاری، عبادت بریلوی، ڈاکٹر ابواللیث، سید عابد علی عابد سب نے اچھے اچھے مضمون لکھے۔۔۔۔۔ لیکن حمید احمد خان کے مضمون کا جو نقش بیٹھ چکا تھا اس پر کوئی اور نقش جم نہ سکا۔

سب کو معلوم ہے کہ مطالعہ غالب حمید احمد خان کا شوق خاص تھا۔۔۔۔۔ انھوں نے دیوان غالب کا نسخہ حمید بڑی کاوش اور دیدہ ریزی سے دوبارہ مرتب کر کے چھپوایا۔ غالب پر متعدد مضامین محققانہ و ناقدانہ لکھے۔ اور اب یہ سب غالبیات کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان مضامین میں، میں نے جن مضمون سے گہرا اثر قبول کیا وہ تھا غالب کا تصور حسن و عشق۔ اس تنقیدی مضمون کے مطالعہ سے مجھ پر مطالعہ غالب کی بہت سی راہیں کھلیں۔۔۔۔۔ اور اب جب کہ ”غالبیات“ خود ایک وسیع علم اور فن ہے اور سیکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں اور مقالے اس موضوع پر منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں بہت سے خاص الخاص ہیں یہ حقیقت ہے کہ حمید احمد خان کا مذکورہ بالا مضمون آج بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور میں اسے خان صاحب کا عطیہ خاص اور فیض وافر کا درجہ دیتا ہوں۔ میں ضرورت کے وقت آج بھی اسی مضمون کو دیکھتا ہوں۔ خان صاحب کے میدان تحریر ایک سے زیادہ تھے اور میں پہلے بحیثیت طالب علم و مدرس اور بعد میں بحیثیت دوست ان کی ہر تحریر کو پڑھنے کا عادی تھا۔ مجھے ان کی انشائی تحریروں میں ان کے دو مضمون بہت اچھے لگے۔ ایک کا عنوان ہے ”انگریزی معاشرت میں کتے کی حیثیت“ اور دوسرا ہے۔ ”بھارت یا بڑائے اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اردو کے انشائی ادب میں اس رتبے کے مضامین کچھ زیادہ نہ ملیں گے۔

حمید احمد خان ایک خاص اسلوب بیان کے مالک تھے۔ ان کی تحریروں میں ضبط و نظم کے ساتھ ساتھ ایک ایسا حسن اور سلیقہ بھی نظر آتا ہے جو اردو فارسی کی ادبی روایتوں سے گہرے تعلق کا نتیجہ ہے۔۔۔۔۔ مگر جو چیز ان کی عبارتوں میں قاری کو خاص طور سے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ہے موزوں ترین لفظ کی تلاش۔۔۔۔۔ تحریر کی طرح ان کی تقریر میں بھی یہ خاص وصف تھا کہ وہ اپنے مطالب کے لیے مناسب ترین لفظ تلاش کیا کرتے تھے۔۔۔۔۔ اور تحریروں میں تو ایسے گوہر کی جستجو میں وہ پہرے غواہی کرتے۔۔۔۔۔ اور جب تک یہ درنایاب حاصل نہ ہو جاتا اس وقت تک اپنی کاوش جاری رکھتے۔ خان صاحب کی عبارتوں میں جھول اخلا اور سستی بندش کبھی نہ آئے پاتی۔ ان کی نثر پلاسٹک آرٹ کے مانند حسن تکمیل کی معراج تھی۔

حمید احمد خان کی تحریروں میں منطق اور معقولیت کا پلہ بھاری رہتا تھا مگر خیال انگیز اضافتوں اور ترکیبوں کی چاشنی ان میں نیم شگفتگی اور دلاویزی کی کیفیت پیدا کرتی تھی۔

ان کے اسی ایک فقرے کو دیکھیے: "تنقید ادب ایک جمہوری دنیا ہے جس میں اقلیدی ہم آہنگی کی تلاش ایک فعل عبت ہے۔"

یہ عبارت بھی ملاحظہ ہو:

"اردو میں مدح سے لے کر بھوت تک تغزل اور تقنن کی متعدد تدریجات بھی موجود ہیں۔ نفرت اور محبت کے قطبین کے درمیان شرارت کے خط استوا پر مزاح کا آفتاب چمکتا ہے..... دیکھنا یہ ہے کہ اردو کی دنیا میں شرارت کا خط استوا کہاں واقع ہے اور اس پر مزاح کا آفتاب کتنی مرتبہ چمکا ہے....."

حمید احمد خان ضمنی طور سے فلسفے کے بھی طالب العلم تھے اس اکتساب نے انھیں حکیمانہ تجربے کا عادی بنا دیا تھا۔ ان کی کوئی تحریر ایسی نہ ملے گی جو منطقی تجربے سے خالی ہو یا جس کی بنیادی معقولیت کمزور ہو۔ ان کے ادب کی طرح ان کی ذاتی زندگی میں بھی بہت کچھ تھا جو سیکھنے کے قابل تھا۔ مثلاً ان کی پابندی وقت، ایک قابل تقلید عادت تھی جسے میں نے اپنا ناچا، لیکن اپنا نہ سکا۔ ایک نہایت عمدہ عادت خان صاحب کی یہ تھی کہ وہ دوسروں کے متعلق اپنے ناگوار رد عمل کو دل میں چھپانے سے گریز کرتے تھے..... فوراً ظاہر کر دیتے تھے، ان کے پاس بیٹھنے والوں کے لیے ان کی یہ عادت درحقیقت ایک نعمت تھی.... کیونکہ اس طرح تلافی کا موقع مل جاتا تھا۔

ہم لوگوں کے لیے خان صاحب کی صحبت و رفاقت ایک دبستان کا درجہ رکھتی تھی..... میری طرح ان کے سب نیاز مندوں نے اس مکتب سے بقدر ذوق و ظرف اکتساب فیض کیا مگر یہ ایک لمبی کہانی ہے جو طویل فرصت ہی میں بیان ہو سکتی ہے..... فی الحال تو ان کی موت کے نشیخ سے ہمیں عہدہ برآ ہونا ہے۔۔۔۔۔ اور اس کے لیے بھی ایک عمر درکار ہے۔ سو

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش تلخ

جب یہ ہو جائے گا تو شاید ہم میں سے کوئی حوصلہ مند، مقامات حمیدی لکھ کر حق صحبت اہل کنشت بھی ادا کر دے گا۔

قمر ہاشمی کی عہد آفریں نظم 'دانائی کا آفتاب لینن'

جدید اردو شاعری کی آبرو ہے
اور عصر پیا دہنوں کو فکر و تخلیق کے
سوتلوں سے ہم آہنگ کرتی ہے
ٹریڈ انڈسٹری پبلیکیشن لمیٹڈ
۱۴-ولیت و ہارف روڈ، کراچی ۲

سید قار عظیم

ارمغانِ حالی

(وضاحتی تبصرہ)

(حالی کی برسی کی تقریب میں پڑھا گیا)

شاعروں کے کلام کو اپنے ذوق اور پسند کے مطابق منتخب کرنے اور اس انتخاب کو سرمایہٴ عزیز کی طرح محفوظ رکھنے کا مشغلہ مدتوں سے ہماری مجلسی اور تہذیبی زندگی کا بڑا محبوب مشغلہ ہے۔ کتب خانوں میں طرح طرح کی بیاضوں کی موجودگی اس تہذیبی رواج کی شاہدِ عادل ہے۔ بیاضوں سے قطع نظر تقریباً ڈھائی سو برس کی مدت میں لکھے جانے والے شاعروں کے تذکروں کی ایک مخصوص ترتیب اور ان میں منتخب اور پسندیدہ اشعار کو یکجا کرنے کی روش بھی اسی شوق کی ایک منظم صورت ہے، اس فرق کے ساتھ کہ بیاضوں کے انتخابات کا مقصد ذاتی ذوق کی تسکین ہے اور تذکروں میں آنے والے انتخاب اپنے جمالیاتی انبساط میں دوسروں کو شریک کرنے کی خواہش کا نتیجہ۔ لیکن دونوں طرح کے یہ انتخاب اس لحاظ سے یکساں اور مماثل ہیں کہ ان میں انتخاب کا معیار ذاتی پسند اور ذاتی ذوق ہی ہے۔ تذکروں میں اس طرح کے اشعار کے کلام شاعر کی ذات کا عکس اور اس کے ماحول کا آئینہ ہے، شاذ و نادر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاعر کے کلام، اس کی ذات اور اس کے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول میں ربط پیدا کرنے کی شعوری کوششیں انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوئیں۔

آبِ حیات اور یادگار غالب اس کی بڑی واضح اور نمایاں مثالیں ہیں۔

بیسویں صدی کے شروع میں کلام کے انتخاب کو شاعر کے مخصوص اسلوبِ خیال اور طرزِ بیان کا نمائندہ اور ترجمان بنانے کے رجحان کا آغاز ہوا اور انتخاب کے دامن کو اس حد تک وسیع کیا گیا کہ اس کے گھیر میں چیدہ چیدہ شعروں کی بجائے پوری پوری غزلوں کی گنجائش نکل سکے اور وہیں، نہیم اور خوش ذوق صاحب امتیاز قاری کے لیے اس انتخاب کی مدد سے شاعر کے فکری میلانات کی تجلین اور اس کے فنی قامت کی تعین ممکن بن سکے۔ اردوئے معلّٰی میں شایع ہونے والے حسرت موہانی کے انتخابات اس امتیازی روش کے بڑے وقیع اور قابلِ قدر پیش رو ہیں۔ اس روش نے شعر کے کلام کے انتخاب کو جو علمی رخ دیا، وہ بڑی ادبی روایت کا مستقل رجحان بن گیا ہے اور متوسّطین اور متاخرین میں سے شاید ہی کوئی غزل گو شاعر ہو جس کے کلام کا انتخاب کتابی صورت میں یا رسالوں کی خاص اشاعتوں اور تنقیدی اور تحقیقی مقالوں کے ضمیموں کی شکل میں مرتب اور شایع نہ ہو گیا ہو۔ متوسّطین سے پہلے کے بعض اور متاخرین کے بعد کے شاعروں میں سے بہت سوں کے کلام بھی منتخب اور مرتب ہوئے ہیں لیکن

رسالوں اور مقالوں کی صورت میں مرتب اور شایع ہونے والے انتخابات میں سے اکثر میں معیار و مقدار اور کیف و کم کے فرق کے باوجود یہ بات موجود ہے کہ کلام کو کلیم کے ذاتی احوال اور اس کے عہد کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی صورت حال کے حوالے سے جانچا پرکھا گیا ہے۔

منتخب کلام کے متعلق میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اس میں ذکر صرف غزل کے شعروں اور غزلوں کے انتخاب کا آیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ کچھلے ڈھائی سو برس میں غزل نے ہماری سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے ساتھ رفاقت کا حق جس استقامت اور وفاداری سے ادا کیا ہے اس کا عشرِ عشر بھی دوسری اصناف کے معاملے میں درست نہیں۔ اس لیے ہم جب اپنی شاعری کا یا اس کے منتخب حصوں کا ذکر چھڑتے ہیں تو وہ ذکر حقیقت میں غزل کا ذکر ہوتا ہے۔ دوسری اصناف نظم یا اصنافِ نثر کے انتخاب مرتب اور شایع کرنے کی روش ہمارے ادب میں رواج کبھی نہیں بنی، اور یہ تو شاید کسی نے سوچا ہی نہیں کہ کوئی شاعر اگر نثر بھی ہے، یا کوئی نثر اگر شاعر بھی ہے تو اسے اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ اس کے منتخبات کا مجموعہ مرتب ہو۔ یہ بات سب سے پہلے غالب کے سلسلے میں سوچی اور محسوس کی جانی چاہیے تھی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ غالب کے بعد کی ایک صدی کی ادبی تاریخ میں حالی کی منفرد اور یکہ و تنہا ذات ایسی ہے جن کی حیثیت فائقہ نثر اور نظم دونوں میں یکساں مسلم ہے اور اس مسلم حیثیت کا اعتراف بھی براہِ برہم ہوتا رہا ہے، لیکن نثر اور نظم کا ایسا انتخاب جو حالی کی عظیم الشان فکری اور تخلیقی کاوش کا آئینہ ہو، مرتب کرنے کی سعادت حمید احمد خان صاحب کے حصے میں آئی اور انھوں نے ”ارمغانِ حالی“ اس کا نام رکھا۔

ارمغانِ حالی ۱۸ × ۲۲ کے مسطر پر چھپی ہے اور سرورق، تزیین اور فہرست کے صفحات شامل کر کے اس کی کل ضخامت ۳۱۷ صفحے ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں، مقدمہ اور انتخاب، اور انتخاب کا حصہ مزید دو حصوں میں تقسیم ہوا ہے، حصہ نثر اور حصہ نظم ۲۶۱ صفحے انتخاب کے ہیں اور ۴۵ صفحے مقدمے کے۔ اگر کسی نے دریا کو کوزے میں بند کر لینے والی بات کو محض تکلف یا شاعری کی بات سمجھ رکھا ہے تو اسے کتاب کے ان دونوں حصوں کے ایک ایک لفظ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ حصہ نثر میں حیات جاوید یا دیگر غالب، حیات سعدی اور مقدمہ شعر و شاعری کے علاوہ، متفرق موضوعات پر چھ مقالے، چار کتابوں پر تبصرے اور گیارہ خطوط اور حصہ نظم میں قدیم و جدید غزلیات، رباعیات اور ۱۵ قطعات کے علاوہ، چھوٹی بڑی ۶ نظموں کا انتخاب شامل ہے۔ مقدمے میں پانچ عنوانات کے تحت، حالی کی شخصیت اور کلام کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ پانچ عنوانات یہ ہیں: جوہر قابل اور معاشرہ، حالی کی شخصیت، شاعری، نثر اور حالات۔

”جوہر قابل اور معاشرہ“ میں اس سوال کا مختصر اور جامع جواب دیا گیا ہے کہ جوہر خلاق کا ظہور کسی دہی کمال کا نتیجہ ہوتا ہے یا صرف اکتساب کے عمل اور مقتضیاتِ عصر کا؟۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے حالی کی ذات اور ان کے تخلیقی کارناموں کے متعلق بعض اہم باتیں کہی گئی ہیں، جو اتنی وضاحت کے ساتھ اور اتنے پُر لہجے اور پُر اعتماد انداز میں اس سے پہلے نہیں کہی گئیں، مثلاً یہ کہ :

(۱) ملی و معاشی مقتضیات سے ان کے ذہن کا ہم آہنگ ہونا، ان کی نظم و نثر دونوں میں چھلکا پڑتا ہے۔

(۲) جس طراوت و تخیل کا ثبوت حالی کی شاعری کے بڑے حصے سے ملتا ہے۔ وہ وہی کمال کے بغیر ممکن نہ تھا۔

(۳) اردو میں اصلیت پسندی کی تحریک (منچرل شاعری) کے فروغ کا سب سے طاقتور منبع حالی کا اپنا ذاتی خلوص تھا۔

(۴) حالی نے اپنے ”زندہ“ جاوید قطعات میں نفسِ اجتماعی کے احتساب اور تنقیدِ معاشرہ کے عمل کو ایک نیا جہز ۱۸۹۷ء سے ۱۸۹۹ء تک کی پانزدہ سالہ مدت، جو حالی کی شاعرانہ زندگی کے مرکز میں واقع ہے، ہماری قومی شاعری کے بہترین سال بھی ہیں اور حالی کے شعری اجتہاد کی معراج بھی۔

(۶) قدیم و جدید کے موازنے میں جو سنہرا اعتدال حالی نے قائم رکھا وہ کسی اور کے حصے میں نہ آیا۔ معراجِ بالا بیانات میں سے ہر ایک ایسا ہے جسے عرفِ عام میں دعویٰ کہا جائے گا۔ حالی کی ذات اور ان کی ادبی تخلیقات کے متعلق اس طرح کے دعوے مقدمے کے مختلف حصوں میں چند نہیں بہت سے ہیں اور ہر دعوے میں یہی زور یہی اعتماد اور یہی ادعائی شان ہے، جو ادب کی چند مثالوں میں۔

زندگی کے گوناگوں مسائل پر گفتگو کے دوران میں حسنِ ظن اور سوائے ظن کی مبالغہ آرائی، شخصیتوں کی جانچ پرکھیں تحسین و تنقیص کا اشتداد، کارناموں کی تقدیر و تخمین میں اعتدال و توازن کا فقدان، حقائق کی تفہیم و تعبیر میں تفکر و نقل کے بجائے جذبے کی دخل اندازی ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے ہمارے پورے نظام استنباط کو غیر معتبر اور غیر یقینی بنا دیا ہے۔ ارمغانِ حالی کے مقدمے کا بڑا وصف یہی ہے کہ یہاں طبعِ سلیم نے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھایا اور حقائق کے بیان اور ان کی رشتہ بندی میں فلسفیانہ تجزیے اور منطقی استدلال کو اپنا رہنما بنایا ہے، اس لیے یہاں کوئی دعویٰ ایسا نہیں جسے ثبوت کی پشت پناہی حاصل نہ ہو۔

حالی کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات برابر کہی جاتی رہی ہے کہ ان کے مزاج میں ایسی نرمی اور ایسا دھما پن تھا کہ وہ لڑائی کے بغیر ہتھیار ڈال دیتے تھے۔ ارمغانِ حالی کے مرتب نے اس رائے کو ”حقائق سے چشم پوشی“ کا نتیجہ قرار دیا ہے اور حالی کی زندگی کے چند واقعات بیان کر کے اور کلامِ حالی کی چند ہر محل مثالیں پیش کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ”ذاتی معاملات میں بے انتہا لحاظ و مروت برتنے کے باوجود قومی معاملات میں حالی دو ٹوک بات کرتے تھے۔“

”یہ سچ ہے کہ ذاتی شائستگی کا معیار حالی نے اتنا بلند کیا کہ اپنے عہد میں اپنی نظیر آپ بن گئے، مگر اصول کی خاطر وہی کہنے اور کرتے ہیں جس کی گواہی ضمیر دیتا ہو، سید احمد خان سے قطع نظر، اس دور کا کوئی ادیب حالی کے مانند بے باک اور نڈر دکھائی نہیں دیتا۔“

مقدمے میں حالی کی زندگی، شخصیت اور کلام کے متعلق جا بجا حتمی اور حکی دعویٰ کیے گئے ہیں ان سب کی بنیاد اسی طرح کے استقرائی استنباط پر رکھی گئی ہے، جس کا اظہار اور پیش کی ہوئی مثال سے ہوتا ہے۔ لیکن منطقی استنباط کا یہ عمل کسی ایک جگہ بھی فلسفیانہ تجزیے کو شریک سفر بنائے بغیر قدم نہیں اٹھاتا، اس لیے مقدمہ نگار جب حالی کی شخصیت

تجزیہ کر کے اس کے نقوش کو نمایاں کر لینے کے اہم فریضے سے فارغ ہوتا ہے تو اپنی توجہ حالی کے کلام کی طرف مبذول کرتا ہے کہ اس کے نزدیک کلام حقیقت میں کلیم کی ذات کا عکس اور اس کے اوصاف کا پر تو ہے۔ تناعری کے تجزیہ کی دستان کا آغاز مقدمے میں اس سوال سے کیا گیا ہے:

”معاشرتی علائق کے جزئیات پر یہ توجہ، ہمدردی، ابنائے جنس کا یہ بے لوث تصور پاکیزگی
نفس پر یہ اصرار، حمایت حق میں یہ بے باکی، بلند مقاصد کی لگن اور ضمیر کا یہ خلوص جب
شعر کی تپش میں جلا تو اس سے کیا کیا تیار ہوئی؟“

اس سوال کا جواب وہ بصیرت افروز بحث ہے جو حالی کی شعری تخلیقات اور نثری تصنیفات کے مختلف پہلوؤں پر مقدمے کے اگلے ۲۴ صفحات میں کی گئی ہے۔ اس بحث کو بصیرت افروز میں نے محض رسماً نہیں، بلکہ اس احساس کی بنا پر کہا ہے کہ تنقید، تحقیق اور تجزیہ کے طے جملے عمل نے پہلی بار ہمیں حالی اور اس کے اجتہادات کی روح صبح پہنچنے کا موقع دیا ہے اور پہلی مرتبہ ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ اس عظیم فکری اور فنی انقلاب کا تصور کر سکیں جس کا صور حالی نے اپنی نثر و نظم کے ذریعے چھوٹا کھٹا۔ حالی کے ان اجتہادات کی فہرست طویل ہے جو اس فکری اور فنی انقلاب کا پیش خیمہ بنے جن کا ذکر میں نے ابھی کیا۔ اب انھیں ایک ایک کر کے گن لیجیے:

(۱) نچرل شاعری کا دور ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ حالی کی غزل میں واقعیت پسندی کا آغاز ہوا۔

بے قراری تھی اک امید ملاقات کے ساتھ

اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

یہی واقعیت پسندی مرثیوں میں بھی ابھر کر سامنے آئی ہے

دیکھ لو آج، پھس نہ دیکھو گے

غالب بے مثال کی صورت

نظموں میں ”برکھارت“ بھی اسی لحاظ سے ایک انقلاب آفرین نظم ہے۔

(۲) حالی کا دوسرا اجتہاد یہ ہے کہ انھوں نے نئے نئے خیالات کو نئی زبان میں پیش کر کے قومی شاعری کو مستحکم

بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ اس دعوے کی وضاحت کے لیے فاضل مقدمہ نگار نے تین شعر کے اس قریب کا تجزیہ

کیا ہے جو ترکیب بند موسومہ ”مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ (مرقومہ سنہ ۱۸۸۶ء) کے پہچ میں ایک

جگہ آیا ہے :-

سے

تھٹ پٹے کے دقت گھر سے ایک ٹی کا دیا

ایک بڑھیا نے سر رہ لا کے روشن کر دیا

تاکہ رھگیر اور پردی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آساں گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے
روشنی محلوں کے اندر رہی جن کی سدا

مقدمہ نگار کی ژرف بینی نے ان تین شعروں میں حالی کے فکری میلانات کی جو جھلکیاں دیکھی ہیں ان بجز
قاری کے قلب اور ذہن دونوں کو ایک نئی روشنی عطا کرتا ہے اور اسے پہلی مرتبہ اندازہ ہوتا ہے کہ حالی ادب و
شعر میں کس دور رس انقلاب کے پیش رو ہیں۔ تجزیے کے الفاظ یہ ہیں:

”ان اشعار میں پہلے مصرعے کا پہلا لفظ (جھٹ پٹا) اپنی پوری قوت سے غزل کی زبان پر بیٹھ پھیرتا ہوا
معلوم ہوتا ہے۔ پھر ”مٹی کا دیا“ زرق برق درباروں سے اپنی علیحدگی کا اعلان کرتا ہے۔ اور یہ دیا بازار سے خریدے
نہیں ”گھر سے لاکے“ روشن کیا گیا ہے، جس سے عطا کنندہ کے ایثار و محبت کے ساتھ ساتھ اس کے محدود وسائل
کا اظہار مقصود ہے۔ یہ عطا کنندہ کون ہے؟ محض ”ایک بڑھیا“! (نکہ ایک خوبصورت شہزادی یا لوز جوان شہزادہ)
اس مصنوعی زندگی کی تصویر جو درباروں کے اندر اور جاگیرداروں کے گرد گھومتی تھی، اس بڑھیا کے مٹی کے دیے کی روشنی
میں مدھم مہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مٹی کا دیا بڑھیا کے چھوٹے کے اندر نہیں ”سراہ“ روشن کر دیا
گیا ہے، تاکہ کسی ایک شخص کے بجائے ”ہر اک چھوٹا بڑا“ اس سے فائدہ اٹھائے۔“

حالی کی شناخت اور دریافت کی جس خلاصہ سنی کا سراغ ہمیں اس چھوٹے سے قطعے کے مختصر جامع اور موثر
تجزیے میں ملتا ہے، اس کا اظہار حالی پر لکھے جانے والے صد ہا صفحات میں محض خال خال نظر آئے گا۔ قطعے کا یہ تجزیہ اور
تبصرہ حالی کے دو اور اجتہادات کی نشان دہی کرتا ہے۔ انھیں میں حالی کے اجتہادات کی فہرست میں تیسرے اور چوتھے
نمبر پر رکھ رہا ہوں۔

(۳) اس تجزیے کی رو سے حالی کا تیسرا اجتہاد یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کا رخ حسن و عشق اور رندی و آوارگی کے بازار
سے موڑا اور اس چوراہے کی طرف کر دیا، جہاں سے روزمرہ زندگی گزرتی ہے۔

(۴) اور چوتھا اجتہاد جو ایک لحاظ سے تیسرے اجتہاد کا شاخسانہ ہے، اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ شعر کی زبان
زندگی کی زبان سے الگ نہیں ہو سکتی اور نظم اور نثر کے لفظوں کے درمیان ذات پات کی کوئی تمیز نہیں۔

(۵) حالی بنیادی طور پر معلم اخلاق تھے۔ اس حیثیت سے حالی نے مستقبل کے ادیب اور شاعر کو اجتہاد کے دور سے
دکھائے:

(الف) ایک یہ کہ شاعر اور ادیب نفس اجتماعی کے احتساب اور تنقید معاشرہ کے عمل کو اپنا منصبی فریضہ سمجھ کر
احتساب اور تنقید میں منطق کی متوازن روش اختیار کرے۔

(ب) اور دوسرے یہ کہ وہ خیال اور بیان دونوں کو یکساں اہم جان کر ان جملہ فنی وسائل سے کام لے جن کے بغیر
فن کی رسائی درجہ کمال تک نہیں ہوتی۔

مقدمہ نگار جس طرح حالی کی شخصیت کے صحیح نقش کو ابھار کر سامنے لاتا، اور فکر و ذکر اور خیال اور بیان میں ان کے اہتمام و انتظام کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس طرح اس نے حالی کی ادبی تخلیقات کے رتبے کے تئیں میں بھی بڑی کاوش کی ہے اور مثالوں اور دلیلوں سے ان کے متعلق واضح اور حکمی فیصلے ہم تک پہنچائے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے :

(۱) مدرس ”مذہبِ اسلام“ کے متعلق فاضل مقدمہ نگار کی رائے یہ ہے :

”اس نظم کی مجموعی دردمندی اور صداقت، اس کے موضوع کا عظیم الشان محیط، اس کی رنگ و رنگ سیرت نگاری و تصویر کاری اور اس کا وقت انگیز انداز حکمت و موعظت اسے دنیا کی بڑی نظموں میں جگہ دیتا ہے۔“

(۲) ”گزشتہ ایک سو برس میں نئے تنقیدی نظریات کا ظہور ہوا اور سیرت نگاری نے تفسیر زمانہ کے ساتھ کئی پلٹے کھائے، بائیں ہمہ مقدمہ شعر و شاعری اور یادگار غالب دونوں کا مقام اب بھی اسی طرح مستند اور مسلم ہے جس طرح انیسویں صدی میں تھا۔“

(۳) ”کتاب کے بین السطور کا تمدنی محیط اور اس کے بیان کا اعتدال، متین لہجہ اور متوازن تبصرہ اسے دنیا کی بڑی سوانحی تصانیف میں جگہ دیتا ہے۔“

شاعروں اور ادیبوں کی شخصیت، ان کی ادبی اور علمی خدمات اور ان کے انفرادی کارناموں کی علمی، ادبی اور فنی حیثیت پر اظہار رائے کے سلسلے میں ہماری تنقید میں ہمیشہ سے حد درجے کی افراط و تفریط کا اظہار ہوتا رہا ہے، کبھی محض سہل انگاری اور آسان پسندی کی بنا پر، کبھی پسند اور نا پسندیدگی کے ذاتی میلانات کی وجہ سے، کبھی تعقل و تفکر اور تجربہ اور دلیل کے بجائے محض جذبات کو چراغ رہ گزر سمجھ لینے کی روش کے سبب، کبھی معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی معیاروں کو بلام و کاست قبول کر لینے کی عادت سے مجبور ہو کر اور اکثر بیشتر غیر منصفانہ ناقدانہ ذمہ داری کے تقاضوں سے چشم پوشی کر کے، ناقدینِ ادب نے اس طرح کی آرا کا اظہار کیا ہے کہ نہ ادیب و شاعر کا صحیح چہرہ ہمارے سامنے آیا اور نہ اس کی ادبی و شاعرانہ حیثیت کی صحیح شناخت اور تعین ممکن ہو سکی۔ مصحفی، غالب، مومن، ذوق، ناسخ، نظیر اکبر آبادی اسی طرح کے چند نام ہیں، جنہیں ہم نے صحیح محنوں میں اس وقت پہنچانا ہے جب کسی جرأت مند نے ان کی وکالت کا بیڑا اٹھایا اور رسوم و قیود نے انھیں غلط فہمیوں کے جن دھندلوں میں پھنسیا یا تھا، وہاں سے باہر لا کر ان کے روئے زیبائی کی اصلی جھلک ہمیں دکھائی۔۔۔ اسی طرح کی جرأت مندانہ وکالت کی ضرورت حالی کو بھی تھی، اور وہ وکیل انھیں مرنے کے ٹھیک ۵۶ سال بعد ملا۔۔۔ ارمغانِ حالی کے مرتب نے وکالت کی یہ خدمت جس جوش، ولولے، اخلاص، دیانت اور ذمہ داری سے

۱۔ مقدمہ ارمغانِ حالی - صفحہ ۲۴

۲۔ مقدمہ ارمغانِ حالی - صفحہ ۳۳

۳۔ مقدمہ ارمغانِ حالی - صفحہ ۳۹

۴۔ مقدمہ کے آخر میں تاریخ تحریر ۱۳ دسمبر ۱۹۰۷ء درج ہے۔

انجام دی ہے اس کی مثال ہماری تنقید میں آسانی سے ملنی مشکل ہے۔ حالی کی شخصیت کی شناخت اور ان کے ادبی اور شاعرانہ مرتبے کے تعین میں ہم نے جو کوتاہی برتی تھی اس کا شدید احساس اس وکالت کا محرک بنا اور وکیل نے موکل کے فکری اور تخیلی منابع تک رسائی حاصل کر لے اور اس کے محرکات شعری کا سراغ لگانے کی کوشش اور لگن کے ساتھ کام کی طرح دالی اور اچھی شاعری کو ذاتی کمال اور ماحول کے اثرات کا ملا جلا نتیجہ سمجھنے کی منطق کی رہنمائی میں حالی کی تخلیقات نثر و نظم کو احتساب کی کڑی منبروں سے گزارا، جب کہیں جا کر مقدمے کے ان ۵۴ صفحات کی تخلیق ہوئی ہے جو حالی کی شخصیت کے پورے نقش کو ابھار کر ہمارے سامنے لائے اور ان کی ذات، ماحول اور کلام میں صحیح منطقی رشتہ قائم ہوا۔

مقدمے کے بعد حالی کی نثر و نظم کا وہ انتخاب ہے جس کا ذکر میں شروع ہی میں کر چکا ہوں۔ کسی ادیب یا کشتی شاعر کے کلام کا انتخاب کتنا مشکل کام ہے، اور یہ کام اس صورت میں کیسے مشکل سے مشکل تر بن جاتا ہے جب ادیب شاعر اور شاعر ادیب بھی ہو، اس کا اندازہ صرف اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے جب ہم کسی کا انتخاب کرنے بیٹھیں۔ کلام کو ایک دومرتبہ نہیں بار بار پڑھ کے اور مختلف پہلوؤں سے اس پر سوچ بچار کر کے اخذ و ترک کے بے شمار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے جب کہیں ایسا انتخاب ممکن ہوتا ہے جو ادیب و شاعر کی ذات، اس کے ماحول، اس کے فکری اور تخیلی میلانات اور اس کے فنی مسلک کی صحیح نشان دہی کر سکے۔ ارمغانِ حالی بلاشبہ ایسا ہی انتخاب ہے۔ انتخاب کے حصے میں اقتباسات کے شروع میں جو تشریحی نوٹ، اور متن میں جا بجا جو حواشی شامل ہیں ان سے اقتباسات کی معنویت اور زیادہ واضح ہوتی ہے۔

انتخاب کے کام میں منطق کا پورا اہتمام کیا گیا ہو پھر بھی ہم اسے ذاتی پسند کی چیز کہتے ہیں، سو یہ بات یہاں بھی درست ہے، لیکن ایک فرق اور ایک امتیاز کے ساتھ۔ انتخاب کے مختلف حصوں کا مطالعہ کرتے وقت ممکن ہے کبھی کبھی ہمارا جی یہ چاہے کہ اس میں فلاں چیز بھی شامل ہو جاتی تو اچھا تھا، لیکن یہ شاید ہم میں سے کوئی بھی نہ کہہ سکے کہ اس انتخاب میں سے یہ چیز نکال دی جائے، اس لیے کہ اس حسین انتخاب کی اجتماعی ترکیب جی ہے جس کی مدد سے ہم ایک طرف تو حالی کی فکری روح کو پہچانتے اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو سنتے ہیں اور دوسری طرف اس سیاسی، معاشرتی، تہذیبی ماحول کی واضح جھلکیاں دیکھتے ہیں جس نے حالی کو حالی اور اس کی تخلیقات کو اس عہد کی روح کا حقیقی ترجمان بنایا ہے۔

بچوں کے مشہور شاعر سرور بجنوری کی نظموں کا مجموعہ

○ ”اچھی نظمیں“ ○

کے نام سے شایع ہو گیا

قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

ناشر: مکتبہ اہل قلم ۵۵-۲ کالی منڈی۔ ملتان

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

پروفیسر حمید احمد خاں اور مرزا غالب

پروفیسر حمید احمد خاں کا اس دنیا سے اچانک اٹھ جانا ایک عظیم انسان، ایک عظیم ادیب اور ملت کے ایک عظیم فرد کا اٹھ جانا ہے۔ ان کی ذات میں علم و دانش اور خلق و مروت کی ایسی اعلیٰ صفات مجتمع ہو گئی تھیں کہ اب اس دھب کا کوئی آدمی ہماری محفل میں نظر نہیں آتا۔ خدا بخشنے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ جب تک رہے اصول صداقت کے لیے لڑتے رہے۔ زندگی کی کٹھن سے کٹھن اور پیچیدہ سے پیچیدہ راہوں میں بھی نہ وہ کسی سے مرعوب ہوئے اور نہ کسی کو بے سبب مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ ہاں ان کی شرافت و بصیرت اور حسن اخلاق و حسن عمل کی حکمرانی، ہم سب کے دلوں پر تھی اور آج بھی ہے۔ ایسی حکمرانی جو دل کو آزی و دل داری کے معنی سمجھاتی ہے۔ ادب، احترام کا سلیقہ سکھاتی ہے اور آدمی کو انسان بناتی ہے۔

ہلکا پھلکا چھیرا بدن، مختصر سا قد، یہ قامت کبہ برتھت کبہ کی مثال۔ رُواں رُواں متحرک و فعال۔ پیشانی پر ذہانت و فراست کی چاندنی۔ آوازیں صداقت کی گرمی اور خلوص کی چاشنی، شخصیت میں علم و اخلاص اور شفقت و مروت کی کشش۔ چھوٹوں کے ساتھ بزرگوں کی اور بڑوں کے ساتھ نیا زندوں کی روش۔ جس محفل میں ہوتے، خود پوشی کی کوشش کے باوجود سب کی توجہ کا مرکز بن جاتے۔ شہر شخص انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا، اور اپنا رفیق و عزیز جانتا بالکل اسی طرح جیسے اللہ کے نزدیک طور کی چھوٹی سی پہاڑی سب سے افضل ہے۔

اقبل جبال الارضِ طور و اُمت

لا عظم عند الله قدراً و منزلاً

خوش قسمتی سے راقم الحروف کو بھی پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم سے، شرفِ نیاز حاصل تھا، کچھ چند برسوں میں تو ان سے کئی بار ملنے کا موقع ملا۔ بعض ملاقاتیں دن دن بھیجی تھیں اور کئی وجوہ سے میرے بے فخر و مسرت کا سرمایہ بنیں، باہم مراسلات کا بھی سلسلہ رہا۔ خاص طور پر جس زمانے میں میری کتاب زیرِ طبع تھی اُسے درجنوں خط ادھر سے گئے اور درجنوں ادھر سے آئے۔ اور میرے لیے ہمت افزائی اور لطف ارزانی کے تحفے لائے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس دن انتقال ہوا۔ اسی دن صبح

”اردو شاعر کے تذکرے اور تذکرہ نگاری“ مطبوعہ مجلس ترقی اردو لاہور

میں نے انھیں ایک ذاتی نوعیت کا خط ڈالا تھا۔ خدا جانے یکس کے ہاتھ لگا۔ لیکن میں اس جگہ ملاقات و مراسلت کی حکایت سنانا پسند نہ کروں گا۔ اول اس لیے کہ اس میں قارئین کی دلچسپی کا زیادہ سامان نہ ہوگا۔ دوسرے اس لیے کہ میرے لیے یہ حکایت اتنی لذیذ و عزیز ہے کہ اگر میں اسے اختصار کے ساتھ بھی بیان کروں تو خاصی طویل ہو جائے گا خطر ہے اس لیے اس جگہ پروفیسر حمید احمد خان کے بارے میں ذاتی ملاقات و مراسلات کے حوالے سے نہیں، بلکہ غالب کے حوالے سے کچھ کہنے کی کوشش کروں گا، اس لیے کہ اول اول غالب ہی کی معرفت میں نے انھیں جانا پہچانا ہے، اور غالب ہی کی معرفت میرے دل میں ان کی ناقدانہ ظرف بینی اور عالمانہ صلاحیتوں کا احترام پیدا ہوا ہے۔

ہمارے ہاں غالب کی شاعرانہ عظمت کا حقیقی احساس بیسویں صدی میں مولانا حالی کی یادگار غالب مطبوعہ ۱۸۹۶ء کے بعد ہوا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا مقالہ ”محاسن کلام غالب“ شائع ہوا اور بعض وجوہ سے اس کا شور علمی و ادبی فضا میں اتنا بلند ہوا کہ غالب کے طرف دار اور سخن ہم دونوں غالب کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر یہ سلسلہ بیا قائم ہوا کہ اب تک کسی نہ کسی طور پر جاری ہے۔ نہ لکھنے والے سیر ہوتے ہیں اور نہ پڑھنے والے۔ سیکڑوں کتابیں اور ہزاروں مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن بیسویں صدی کے سارے ذخیرے میں جن بزرگوں کا کام ۱۹۵۰ء سے پہلے کا ہے اور انفرادی و اساسی اہمیت کا مالک ہے۔ ان میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے مولانا غلام رسول مہر نے، شیخ محمد اکرام نے اور پروفیسر حمید احمد خان نے تنقیدی نظر سے کلام غالب کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، مولانا مہر اور شیخ اکرام کے کاموں کی اہمیت کا چرچا عام ہو چکا ہے۔ لیکن پروفیسر حمید احمد خان کی غالب شناسی کی اہمیت و نوعیت سے ابھی تک لوگ کچھ زیادہ واقف نہیں ہیں۔ اس لیے مختصر اظہار خیال نامناسب نہ ہوگا۔

پروفیسر حمید احمد خان شعر و ادب کا فطری ذوق بھی رکھتے تھے، اور مغرب و مشرق دونوں ادب سے اچھی طرح واقف تھے۔ انگریزی اردو اور فارسی ادب پر ان کی نظر و سیع بھی تھی اور گہری بھی۔ ایسی صورت میں اپنے دور شباب میں، اگر ڈاکٹر بجنوری کی طرح، ان کی نظر بھی اردو شعرا میں سے صرف غالب پر آکر ٹھہری، تو چندان تعجب کی بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اس جدید فکر و نظر کی روشنی میں جس کا آغاز دعوت ہمارے مغرب کے زیر اثر بیسویں صدی میں ہوا اور جس نے ایک ملک کے ادب کو، کم و بیش دنیا کے ہر ملک کا ادب بنادیا ہے، اردو کے صرف دو شعراء ایسے ہیں جن کا کلام بیسویں صدی کے قاری کے لیے غیر معمولی کشش کا سامان رکھتا ہے۔ ایک غالب دوسرے اقبال۔ پروفیسر حمید احمد خان کو دونوں کی ذات و صفات سے لگاؤ تھا۔

۱۔ مقدمہ نسخہ حمید یہ مطبوعہ گورنمنٹ پریس بھوپال طبع اول ۱۹۳۱ء

۲۔ غالب نامہ از شیخ محمد اکرام مطبوعہ ۱۹۳۶ء

۳۔ غالب از مولانا غلام رسول مہر مطبوعہ ۱۹۳۷ء

۴۔ غالب کے کلام میں حسن و عشق مطبوعہ ہلالوں ۱۹۳۹ء

غالب سے پروفیسر حمید احمد خان کے لگاؤ کی داستان خاصی پرانی ہے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ
 ”ادامل سن شعور میں غالب کے کلام کے جس پہلے مجھے بہت متاثر کیا وہ مادی
 کائنات کی وسعتوں پر غالب کی ذہنی گرفت تھی۔“

میرے نزدیک غالب کا یہ کمال حیرت انگیز ہے کہ گو میری زندگی نے کئی پلٹے کھائے مگر
 عمر کے کسی مرحلے میں بھی غالب نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔

غالب کا کلام، پروفیسر حمید احمد خان کے لیے ذوق طبع کی وقتی تسکین یا تفریح طبع کا ذریعہ نہیں رہا بلکہ انھوں
 نے پوری سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ غالب کی زندگی اور کلام کو اپنے مطالعے کے لیے انتخاب کیا ہے۔ ان کا مطالعہ
 تحقیق و تنقید دونوں نقطہ نظر سے غالب شناسی کے سلسلے میں حدود درجہ اہم اور منفرد ہے۔

تحقیق کے سلسلے کا ان کا اہم ترین کام نسخہ حمید کی نئی ترتیب و تدوین اور تازہ اشاعت ہے۔ نسخہ حمید
 غالب کا وہ مجموعہ کلام ہے جس کا قلمی نسخہ مرقوم ۱۲۳۱ھ بھوپال میں دستیاب ہوا اور مفتی انوار الحق کے زیر اہتمام بعد از اب
 حمید اللہ خاں ۱۲۹۲ھ میں بھوپال سے شایع ہوا۔ اس میں چوبیس سال تک کی عمر کا تقریباً سارا کلام ہے اور غالب کا متداول دیوان
 اسی سے ماخوذ ہے۔ ہر چند کہ ”نسخہ حمید“ کی اشاعت میں بڑی احتیاط و اہتمام سے کام لیا گیا۔ پھر بھی بعض باتیں اہل نظر کو مشکوک تھیں
 لیکن مطبوعہ اور قلمی نسخوں کے گہرے تقابلی مطالعے کے بغیر کچھ لکھنا بہت مشکل تھا۔ یکام وقت محنت اور وقت نظر کے ساتھ ساتھ
 کلام غالب کا وسیع مطالعہ چاہتا تھا۔ شاید اسی لیے پروفیسر حمید احمد خان کے سوا کسی اور کو اسے ہاتھ لگانے کی ہمت نہ ہوئی

پروفیسر حمید احمد خان اسی کام کے لیے ۱۳۳۸ھ میں بھوپال گئے اور کتب خانے میں بیٹھ کر نسخہ حمید کے مطبوعہ
 قلمی نسخے کی ایک ایک سطر کا تقابلی مطالعہ کیا۔ بعد کو اس مطالعے کے نتائج ”نسخہ حمید“ اور غالب کے سلسلے میں ثابت
 اہم ثابت ہوئے۔ اگر پروفیسر حمید احمد خان ۱۳۹۳ھ میں یہ کام نہ کر لیتے تو شاید نسخہ حمید کو دوبارہ متنی صحت کے ساتھ
 شایع کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس لیے کہ کچھ دنوں بعد ”نسخہ حمید“ (قلمی) بھوپال کی لاہری سے غائب ہو گیا اور
 ابھی تک اس کا سراغ نہیں لگا۔ نسخہ حمید (مطبوعہ) بھی کیاب نہیں پایا ہے۔ ایسی صورت میں نسخہ حمید کی
 از سر نو ترتیب تدوین اور حدود درجہ کارآمد حواشی و مقدمہ کے ساتھ اس کی اشاعت سے اردو زبان و ادب اور غالب سے
 دلچسپی رکھنے والوں پر پروفیسر حمید احمد خان کا ایسا احسان ہے جسے ادب کی تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی۔

مفتی انوار الحق نے مطبوعہ نسخے کے دیباچے میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ قلمی نسخے کے حاشیوں پر جو اضافے اور
 متن کی اصلاحیں درج ہیں وہ ۱۲۳۸ھ میں لکھی گئی ہیں۔ حمید احمد خان نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ
 حاشیے کے اضافے اور اصلاحیں غالب کے سفرِ کلکتہ پر روانہ ہونے سے پہلے، یعنی ۱۲۲۶ھ تک تصنیف ہو چکے تھے
 قلمی نسخے پر چونکہ ۱۲۳۲ھ کی ایک مہر فوج دار محمد خاں کے نام سے ثبت تھی اس لیے مفتی صاحب نے یہ قیاس کیا

لے ”غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں“ مطبوعہ مجلس یادگار غالب لاہور ۱۹۶۹ء

لے ”نسخہ حمید“ مرتبہ پروفیسر حمید احمد خان مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء

کہ قلمی نسخہ مجموعہ پال پینچنے کے بعد ایک بار پھر اصلاح اور اضافہ کے لیے دہلی گیا۔ لیکن یہ قیاس بھی پروفیسر حمید احمد خان کے نزدیک بے بنیاد ہے۔ مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخے کا اہم نقش یہ ہے کہ اس میں قلمی نسخے کی اصل ترتیب کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ بعض جگہ مفتی صاحب سے یہ فرد گذاشت ہوئی ہے کہ وہ مطبوعہ نسخے اور قلمی نسخے کے متن کے اندر اپنا میں امتیاز نہیں کر سکے۔ پروفیسر حمید احمد خان کے مطبوعہ نسخے میں یہ کمزوریاں نہیں ہیں اور ”نسخہ حمید“ کا نقش ثانی، نقش اول سے زیادہ مفید و معتبر ہے۔ ساتھ ہی پروفیسر حمید احمد خان نے ”نسخہ حمید“ کے سلسلے میں بعض ایسے اہم سوالات اٹھائے ہیں جو اہل تحقیق کے لیے توجہ طلب ہیں۔ مثلاً عبدالعلی، عبدالصمد مظہر، اور آغا علی جنھوں نے غالب کے اشعار پر گاہ بگاہ صناد کیا ہے، کون حضرات ہیں؟ حافظ معین، جنھوں نے پورا دیوان خوش خط لکھا ہے، کون صاحب تھے؟ غالب نے قیام دہلی کے زمانے میں کون کون سی غزلیں کہی ہیں اور کون کون سی غزلیں آگرے کی یادگار ہیں؟ مختصر یہ کہ ”نسخہ حمید“ مرتبہ پروفیسر حمید احمد خان کو جوہ سے بہت اہم ہے۔ اس میں نسخہ حمید اور غالب کے متعلق بعض مغالطوں کو دور کیا گیا ہے اور بعض ایسے مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے جن کی تفتیش غالب کے سلسلے میں بہت ضروری ہے۔

کلام غالب کی تنقید کے سلسلے میں بھی پروفیسر حمید احمد خان نے اردو، انگریزی میں کئی مقالے لکھے ہیں لیکن سب سے اہم اور منفرد مقالہ وہ ہے جو بعنوان ”غالب کی شاعری میں حسن و عشق“ اول اول فروری ۱۹۴۹ء کے ہمایوں (لاہور) میں شائع ہوا۔ نظر ثانی کے بعد اب وہ ”تنقید غالب کے سو سال“ میں شامل ہے۔ ڈاکٹر بجنوری کے مقالے کے بعد کلام غالب پر یہ دوسرا تنقیدی مقالہ تھا جس نے غالب کی طرف پھر ایک بار لوگوں کو متوجہ کیا۔ یہ مقالہ ڈاکٹر بجنوری کے مقالے کی طرح اپنے قاری کو جذباتی سطح پر متاثر نہیں کرتا بلکہ اس کا رخ جذبے سے کہیں زیادہ فکر و سمجیدہ کی جانب ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، اگرچہ فلسفے کے آدمی تھے۔ لیکن محاسن کلام غالب میں ان کا رویہ عموماً فلسفیانہ نہیں جذباتی ہے۔ پروفیسر حمید احمد خان کو بھی اگرچہ غالب اور کلام غالب سے جذباتی لگاؤ ہے۔ لیکن اس لگاؤ کو انھوں نے فکر و شعور کی گرفت میں رکھا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا مقالہ قاری کے جذبات کو نہیں فکر و ذہن کو اپنا مخاطب بناتا ہے۔

غالب کے متعلق بعض ناقدین کی رائے ہے کہ ان کا کلام فکر و فلسفہ کی گہرائی، نفسیات انسانی کی گرہ کشائی اور مسائل حیات کی ترجمانی کے لحاظ سے تو بہت بلند پایہ ہے۔ لیکن حسن و عشق کے باب میں ان کے یہاں وہ تعمق و تنوع نظر نہیں آتا جو اردو کے بعض دوسرے شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خان کا مدلل و مربوط مقالہ اس رائے کی تردید کرتا ہے۔ اس مقالے کی ابتدائی سطر میں دیکھیے:

”غالب کے اردو و فارسی کلام میں حسن و عشق کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہے۔ تعداد کے لحاظ سے پورے کلام میں اس مضمون کے اشعار ایک تہائی کے قریب ہوں گے مان

۱۔ ”تنقید غالب کے سو سال“ مطبوعہ مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء

میں وہی تنوع، ہمت طرازی اور نکتہ آفرینی نظر آتی ہے جو دیوان و کلیات کے دوسرے مضامین کا امتیاز خاص ہے اگر مرزا غالب اپنے کلام کا صرف یہی حصہ چھوڑ جاتے تو بھی ان کا شمار دنیا کے بڑے شعرا میں ہوتا۔ ان اشعار میں محض رنگ و نغمہ طلمات کے بند دروازے ہی نہیں کھلتے، ان میں شاعری کی ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے اس دنیا کی آب و ہوا ہر طبیعت کو سازگار نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی وسعت اور بوقلمونی کا یہ عالم ہے کہ ہر موقع کی مناسبت سے دل گٹا منظر بکثرت ملتے ہیں انسانی فطرت کے نامحدود پہلو، جذبہ عشق کے ماتحت جس طرح بنتے، سنورتے، بگڑتے، پگھلتے اور ڈھلتے ہیں۔ اس کی ترجمانی میں شاعر نے اپنا تمام جوش و خیل اور پورا ذوق و قلم صرف کیا ہے۔

یہ دعویٰ بے دلیل نہیں ہے۔ پروفیسر حمید احمد خان نے غالب کی ساری اردو فارسی شاعری کو نظر میں رکھ کر نتیجہ اخذ کیا ہے۔ تقریباً پچاس صفحوں کے طویل مقالے میں اپنی بات کو سمجھانے کے لیے تحلیل و تجزیہ، توجیہ و تاویل اور استدلال و اظہار کا ایسا خوبصورت پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اور اپنے خیال کی عکس ریزی کے لیے جگہ جگہ اشعار و امثال کے ایسے مرقعے پیش کیے گئے ہیں کہ قاری کو پروفیسر حمید خان کی رائے سے اتفاق کرنا ہی پڑتا ہے۔ مقالے کا یہی وہ رخ ہے جس نے اردو ادب کے قارئین کو چمکایا ہے اور پروفیسر حمید احمد خان کی رائے کو غالب شناسی کے سلسلے میں ہمیشہ کے لیے متعلل راہ جانا ہے۔

پروفیسر حمید احمد خان نے غالب اور غالب کو صرف اپنے مطالعے کا موضوع نہیں بنایا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے دوسروں کو بھی غالب پر کام کرنے کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ غالب سے دلچسپی رکھنے والوں پر ان کا ایک احسان یہ ہے کہ ان کی توجہ سے غالب کی ساری اردو فارسی نثر و نظم مفید حواشی اور کارآمد مقدموں کے ساتھ مطبوعہ شکل میں دستیاب ہو گئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانے میں ایک جامع منصوبہ تیار کرایا۔ مجلس یادگار غالب نے ان کی سرپرستی میں غالب کی ساری تصانیف کو نئی صورت کے ساتھ شایع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

یہ کام بہت مشکل تھا۔ لیکن خاں صاحب مرحوم کی ان تنگی گوششوں سے تکلیف کو پہنچ گیا اور اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ اگر اب کسی کتب خانے میں مجلس یادگار غالب کی مطبوعات موجود نہ ہوں تو اسے مطالعہ غالب کے سلسلے میں ناقص ہی سمجھا جائے گا۔

نثر و نظم غالب کی پندرہ مجلدات کے علاوہ اس موقع پر مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی نے چار کتابیں اور شایع کیں۔

اے "نقد غالب کے سو سال" ص ۲۳۲ مطبوعہ مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۹ء

- (۱) "تنقید غالب کے مسائل" مرتبہ فیاض محمود اور انبیا حسین
 (۲) "غالب تاثرات کے آئینے میں" مرتبہ عبدالشکور احسن اور سجاد باقر فریدی
 (۳) اشاریہ غالب از سیہ مبین الرحمن
 (۴) — GHALIB: A CRITICAL INTRODUCTION از سیہ فیاض محمود

پہلی کتاب میں ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۹ء تک کتاب پر لکھے جانے والے اُن تنقیدی مقالات کا انتخاب ہے۔ جن میں کوئی نئی یا اور کچھ بات کہی گئی ہے۔ دوسری کتاب میں ملک کے ممتاز اہل قلم نے یہ بتایا ہے کہ اُن کی ذاتی زندگی کو غالب نے کس کس طرح سے متاثر کیا ہے۔ تیسری کتاب میں تسلیمِ غالب کی مختلف اشاعتوں کے ساتھ ساتھ غالب پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی تلخیص سمیٹی گئی ہے۔ چوتھی کتاب انگریزی زبان میں ہے اور اس کا اصل مقصد انگریزی خواں طبقہ سے غالب کو متعارف کرانا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ پروفیسر حمید احمد خان نے مجلس یادگار غالب کی اُن تبلیغی اہمیتوں میں، غالب اور غالبیات کو بزرگوں یا۔ اب جس کتاب خانے میں یہ کتابیں موجود ہیں گویا اس میں غالب اور غالبیات سے متعلق ساری بنیادی محرمیں موجود ہیں۔

غالب اور کلام غالب سے پروفیسر حمید احمد خان کی یہ دلچسپی اردو سے ان کے گہرے لگاؤ کا ثبوت ہے۔ پڑھائی اعموں نے عمر بھر انگریزی لیکن محبت انہیں اردو سے رہی۔ انگریزی ادب اور مغربی علوم سے جو کچھ انھوں نے حاصل کیا، اردو کے حوالے کیا۔ وہ اردو کے ممتاز ناقد و ادیب ہی نہیں۔ اس کے سچے عاشق اور جاں باز محافظ بھی تھے۔ جب تک رہے اردو کی حفاظت و اشاعت کے لیے سینہ سپر رہے۔ ہر جگہ اور ہر موقع پر انھوں نے اردو کا نام ادا کیا رکھا اور اردو کے نام لیاؤں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ مجلس ترقی ادب لاہور کے ناظم کی حیثیت سے اردو کا مسکس کی اشاعت کی رفتار انھوں نے کچھ اور تیز کر دی۔ اُن کی نگہانی میں اساتذہ قدیم کی درجنوں کتابیں، صحتِ متن اور منیرِ خوشی و مقدمات کے ساتھ منظرِ عام پر آئیں۔ کلاسکس سے متعلق متعدد تحقیقی مقالے بھی شایع ہوئے جن میں غالب کے موقع پر بھی بعض اہم کتابیں چھاپی گئیں۔ ان میں کلیات غالب (فارسی)، جلد اول و دوم، دیوان غالب، نسخہ شیرانی اور یادگار غالب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہی نہیں بعض اہل علم کی طرف سے شہیدِ محالفت کے باوجود انھوں نے پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ ادبیات کا ایک شعبہ قائم کیا۔ مسلمانانِ پاک و ہند نے عربی، فارسی، اردو اور علاقائی زبانوں کی معرفت جو ثقافتی سرمایہ یادگار چھوڑا تھا۔ اسے کئی جلدوں میں شایع کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ اس مرحلہ کی اور نہ جانے کتنی باتیں ہیں جو ہمارے دلوں میں خان صاحب مرحوم کی یاد کو تازہ رکھیں گی۔ لیکن اگر وہ یہ کچھ بھی نہ کرتے، تو بھی غالب کے سلسلے کا وہ تحقیقی و تنقیدی کام، جس کا ذکر اوپر قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے، اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اُن کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے بہت کافی تھا۔

جواب طلب امور اور مستودات کی واپسی کے لیے

جو ابی لفافہ یا ٹکٹ ضرور بھیجیے۔ ادارہ افکار ہر خط کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

محمد علی صدیقی

اقدار کا سفیر

۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو پروفیسر حمید احمد خاں بھی مرحوم ہو گئے۔ اس مرگت دین کے دور میں وہ آسودہ انقلابی تھے اور نہ دل آزار روشن خیالوں کے اُس طائفہ بے ہنراں کے رکن جو باتیں زیادہ کرتے ہیں اور کام کم۔ پروفیسر حمید احمد خاں کام کے معاملہ میں ”سید“ تھے جس نکتے سے انھوں نے غالب صدی کے موز پر پنجاب یونیورسٹی سے تصانیف غالب کی چھوٹی موٹی لائبریری طبع کروائی اُس کے ساتھ اگر خود اپنی کتاب ”غالب“ کو بھی مکمل کر لیتے تو آج ان کا مقام واللہ عظم کیا ہوتا۔ وہ شاعرین غالب کی صف سے ہٹ کر کسی اور صف میں ہوتے۔ وہ غالباً غالب کے پہلے ثقافتی نفاذ (KULTURE KRITER) ہو سکتے تھے۔

نئے دور کے محرطانوں کے ساتھ ساتھ ہیں کچھ ”محررانِ شبستان“ ایسے بھی عزیز ہوئے چاہیں آخر ایسے نقطہ سے کیوں بات شروع کی جائے جس کے پیچھے علم و دانش کی کوئی صداوت اور طاوت ہی نہ ہو اور پورا ماضی دریا برد کرنے کا معاملہ درپیش ہو۔ میں تو سوچتا ہوں کہ آخر کیفیتِ شمس میں بھی کوئی تو مثبت پہلو ہوگا۔ جسے ہم پروفیسر یانگ جنگ (PROF. YANG JUNG KUO) کے بغیر بھی دریافت کر سکتے ہیں۔ اور ہمارے پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم تو ایک ایسی تہذیب کے رسیا تھے جس کے سب سے بڑے شاعر نے خود کو ”آدھا مسلمان“ کہنے کے باوجود بھی پوری تہذیب کی نمائندگی کی تھی۔ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نظریۂ پاکستان کی برصغیریت کے بڑے قائل تھے لیکن وہ اس قدر وسیع المنہب بزرگ تھے کہ جب اسلام کا لچ دو حصوں میں تقسیم ہوا تو انھوں نے اپنے کا لچ کے لیے پروفیسر ایرک سپرین کا انتخاب کیا۔ پروفیسر این مغل کا تقریباً بھی خود انھوں نے کیا اور فیض احمد فیض کی گزشتہ اسیری کے دوران اُن کی ربائی کے لیے جس وفد نے بھاگ دوڑ کی تھی اُس کے سربراہ پروفیسر حمید احمد خاں ہی تھے۔ برصغیر کی اصطلاح خود مسلمانوں نے وضع کی تھی۔ انگریزوں نے اسے جوں کا توں لے لیا۔ جنگِ پلاسی تک متحدہ

اے یہ ترکیب جون ایلیا کے ایک شعر سے اخذ کی گئی ہے جو یوں ہے
شبِ خونِ ای اے ہے فیصلہ کاوش کہن
پر کچھ ”محررانِ شبستان“ بھی ہیں عزیز

ہندوستان کا خیال فرض محال تھا۔ لیکن جب متحدہ ہندوستان ایک حقیقت بن گیا تو انگریزوں نے "ہندوستانی قومیت" کی تشکیل کے لیے کچھ بنیادی سیاسی ڈھانچہ کھڑا کیا۔ لیکن عجیب معاملہ ہے کہ جب سرسید احمد خاں کا ہیوم کی کانگریس پر اعتراضات میں سب سے تیز اعتراض اس جزیرہ نما ہندوپاک کے کثیر الاقوامی سماج پر تھا۔ جو صرف "بزدل جبر ہی ایک قومی بنایا جاسکتا تھا" سرسید نے برصغیر کی اصطلاح کا بار بار استعمال کیا اور اس سے جغرافیائی ہندوستان کا کثیر الاقوامی کردار ثابت کرنا مقصود تھا۔ علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد (۱۹۳۰ء) سے لے کر باقی پاکستان کے بیشتر خطبات میں برصغیر کی اصطلاح ایک ممکنہ غلط فہمی کے ازالہ کے طور پر یہ حقیقت حال کے اعتراف کے طور پر جا بجا استعمال ہوتی آئی ہے۔ تاہم کہ اپریل ۱۹۴۷ء سے دہلی معاہدہ کے متن میں بھی یہی اصطلاح جغرافیائی معنوں میں استعمال ہوئی بالکل اسی طرح جیسے اسٹینڈی نیویا اور آئی بی ریائی اصطلاحیں جو ناروے۔ سوئیڈن۔ ڈنمارک۔ آئس لینڈ اور اسپین۔ پرتگال کے لیے بلا تکلف استعمال ہوتی رہتی ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں انہی معنوں میں برصغیر کی اصطلاح استعمال کرتے تھے اور ہندوستانی۔ مسلم تہذیب کے عاشق تھے۔

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم برصغیر کے مسلم ماضی کے سحر خاں شہباز کے گرویدہ تھے۔ سیاسی اہتری اور شکست خوردگی کے دور میں ان کا سارا تفاخر غالب کی ذات میں مرکوز ہو کر رہ گیا تھا۔ انہوں نے طرف دار غالب بن کر اس پورے تہذیبی سلسلہ کی وکالت کرنا چاہی تھی جس کی محبت میں غالب نے آئین اکبری کے تبیح شدہ ایڈیشن کے لیے سرسید احمد خاں کی فرمائش پر ایک ایسی تقریظ لکھی تھی جو سرسید احمد خاں کو بھی ناگوار گذری تھی۔ غالب جتنے ذہین اور حساس تھے اتنے ہی حقیقت پسند بھی۔ ان کی تقریظ سے ان کی قوم میں شکست خوردگی کی بجائے جذبہ تعمیر، شوق اخذ و کتاب اور فرسودہ روایت اور تقلید پرستی سے سخت بنیاری کا ثبوت ملتا ہے۔ اس قسم کا نقطہ نظر ان کے ہندوہم وطنوں میں راجہ رام موہن رائے مدیر مرقا الاخبار کے یہاں بھی ملتا ہے۔ غالب نے اس اخبار کا قیام کلکتہ کے دوران مطالعہ کیا ہوگا۔ ان کی تقریظ میں مندرج بہت سی دریافتیں اور ایجادات سے سائنسی فکر کی توہمات پر بلا دستی ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے پروفیسر حمید احمد خاں نے غالب پر اپنی توجہ مرکوز کر کے دراصل برصغیر کے مسائل کی نص پر انگلی رکھ دی تھی۔ سرسید احمد خاں دلی کالج کے تجربہ سے بہت مسرور ہوئے تھے۔ اس کالج میں انگریزی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کے حق میں فتویٰ دے کر علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔

غالب کے بعد وہ سرسید احمد خاں، حالی، شبلی، سید سلیمان ندوی اور اقبال کو اپنے سفر کی منزلیں بناتے ہوئے ہمارے دور میں داخل ہوئے ہیں۔ ان کے برادر بزرگ مولانا ظفر علی خاں مرحوم بھی غالب کے شیدائی تھے، وہ بھی برق صفت اور صاحب اسلوب شاعر تھے۔ زینت دار نے مسلم ہندوستان کے مسائل کو ایک مخصوص نظر اور فہم کے ساتھ پیش کیا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم برصغیر گیر شہرت کے مالک تھے اور اس میں کیا تعجب ہو سکتا ہے کہ ایک ایسے خاندان میں مسلم برصغیر کی ممانعتوں اور اختلافات کے مقابلہ میں ممانعتوں کا پلڑا جھکا ہوا ہی رہے گا۔ سو وہ رہا بھی۔ اب کیا کیا جائے، یہ اتنی بڑی حقیقت ہے۔ جتنی اس کے برعکس کوئی صورت ہو سکتی ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم یکم نومبر ۱۹۲۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے بھائیوں، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حامد علی خاں (کریم آباد وزیر آباد) سے چھوٹے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وزیر آباد اور لاہور میں ہوئی جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے اور پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ اسلامیہ کالج میں لکچرار مقرر ہوئے۔ مزید تعلیم کے لیے وہ برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی گئے اور وہاں سے ایم۔ لیٹ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک اسلامیہ کالج میں شعبہ انگریزی کے صدر رہے۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۳ء تک اسلامیہ کالج کے پرنسپل رہے ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے اور ۱۹۶۹ء میں عین غالب صدی کے ہنگام میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے۔ لیکن اپنی عمر کے آخری لمحہ تک وہ غالب پرست رہے۔ اقبال کے لیے بھی ان کے دل میں بہت احترام تھا۔ اور وہ کلام اقبال کے بہت اچھے شارح بھی تھے۔ لیکن تصانیف غالب کی پاکستان میں بڑے پیمانہ پر دوبارہ دستیابی میں پروفیسر حمید احمد خاں کا بہت اہم حصہ رہا ہے۔ اگر وہ بہت بااثر سیاسی شخصیت ہوتے تو ان کی معارف پروری کے بڑے چرچے ہوتے۔ لیکن وہ ایک سیدھے سادے مخلص عالم تھے۔ اس لیے اتنا بڑا کام کر سکتے کے باوجود ابھی تک بہت سے عالموں کو پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی خدمات سے روشناس کر دینا اس لیے بھی ضروری ہے کہ انھیں اندازہ ہو کہ کام کرنے کے یہ انداز ہوتے ہیں!

۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء میں انھوں نے ایشیائی، افریقی، اسلامی کانفرنسیں منعقدہ جکارتا اور ہندوستان میں پاکستانی وفد کی قیادت کی اور وہاں مشرقی بعید میں تصوف کے موضوعات پر کچھ مواد جمع کیا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور زیادہ مطالعہ یقینی طور پر تخلیق کے خلاف نہیں جاتا تو کم از کم اس میں تعطل کی سی کیفیت ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ غالب کے نسخہ امروہہ کے سلسلہ میں ہونے والی پہلی تقریب میں پروفیسر حمید احمد خاں کی زبانی "تقریر کے بارے میں نقوش غالب نمبر (۳) میں مدیر رسالہ کا ایک نوٹ ہے کہ پروفیسر حمید احمد خاں کی تقریر اس لیے طبع نہ ہو سکی کہ زبانی ہونے کی وجہ سے وہ ضبط تحریر میں نہ آسکی۔ ٹھیک بھی ہے۔ پروفیسر مرحوم غالب صدی کے اہتمام میں رات دن ایک کرتے یا معنائیں لکھتے۔

پروفیسر حمید احمد خاں نے پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے کچھ عرصے بعد مجلس ترقی ادب کی سربراہی قبول کر لی۔ اور یہاں بھی ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں وہ اپنے قریبی دوستوں اور اعوان کو غلامی متاسف اور دل شکستہ نظر آئے۔ خاص طور پر غلام اقبال کی یوم ولادت کے سلسلہ میں تنازعہ سے جو ان کی سرکردگی میں ایک سرکاری کمیٹی نے بہت خوش اسلوبی سے طے کر دیا تھا اور اسی کی بنیاد پر اقبال کا یوم ولادت ۲۹ دسمبر ۱۹۷۳ء ٹھہرا تھا۔ صحیفہ کا اقبال صدی نمبر بھی اسی وجہ سے اس سال کے شروع میں چھپ گیا۔ لیکن کچھ حضرات تاریخ کے نظریے سازش کے اس قدر شکار ہیں کہ انھوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور علامہ اقبال کی چھوٹی بہنوں کو ان سے بڑا ثابت کر کے چھوڑا۔ اخبار جہاں مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۷۳ء میں علامہ اقبال کے برادر بزرگ کے داماد صوفی نظیر کا ناقابل تردید شواہد رجن میں پیدائش سرٹیفکیٹ کی نقل بھی شامل ہے! پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کے دعوے کا بہترین ثبوت ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی تہذیبی وفاداریوں میں خود اُن کے صوبہ اور مادری زبان کا حصہ کچھ کم نہ تھا۔ "افکار" کے انقلاب نمبر (سالانہ) میں عوامی کہانیوں کے ذیل میں پروفیسر حمید احمد خاں کی کہانی میرا بچھا (بچپن) سے پر ماتک، میں شامل ہے، کے مطالعہ سے پنجابی ادب کے اس شاہکار سے اُن کی روحانی وابستگی اُن کی ثقافتی وفاداری کا پہلا دائرہ ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"انھار میں صدی میں مغلوں کے زوال کے ساتھ فارسی زبان کو بھی زوال آیا اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف بولیوں نے مرکز کا لاجس طرح دہلی کی مقامی بولی نے اردو بن کر فارسی کی جگہ لی اسی طرح مغربی پنجاب میں خود اس علاقہ کی بولی ادبی کاوش کا موضوع بنی تعمیر اور سودا کا پنجابی ہم عصر وارث شاہ ہے جس نے فارسی کے زوال کے بعد اپنے دہلوی معاصرین کی طرح زبان و ادب میں ایک ترقی پسندانہ قدم اٹھایا۔ اُس نے اپنی عظیم انسان پنجابی نظم کے لیے میر اور رانجھا کا مقبول عام قعد انتخاب کیا اور اُسے دیہاتی پنجاب کی زندگی کے رس میں اس طرح سمیٹا کہ اُس کا مزاج بھی دیہاتی تازہ ہے۔"

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی وفاداری کا دوسرا دائرہ مسلم ہندوستان کی مرکزیت کے زیر سایہ پران چڑھتی ہوئی تہذیب ہے اور وہ اس دائرہ کے ذریعہ تیسرے اور سب سے بڑے دائرہ یعنی آفاقی دائرہ تک پہنچتے ہیں۔ آج کل بہت سوں کو پہلے دائرہ کی نزکسیت ہی سے فرصت نہیں ہے۔ دوسرے اور تیسرے دائرے کے لیے ریاض کرنے کا یا راکس کو ہے۔ پہلے دائرہ کے بعد اب دوسرے اور تیسرے دائرے بھی پہلے دائرہ کی اتالی بڑھتی ہوئی شکلیں بنتے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت حال میں صحت مند اندہ ماضی پر کافی دباؤ پڑ رہا ہے، کلاسیکی ادب سے مغائرت کے سبب جدید ادب کی تفہیم بھی مشکل ہو رہی ہے اور وہ کی طرح قوم بھی برہنہ تن نظر آ رہی ہے۔ ماضی سے غافل حال سے بیزار اور مستقبل سے خائف لوگوں میں خوفناک نفسیاتی خواہشات پیدا ہو جاتی ہیں اور آج کچھ ایسا نظر آ رہا ہے کہ اقدار کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے لیکن متبادل اقدار واضح طور پر کہیں آس پاس نظر نہیں آتیں۔ ممکن ہے کہ وہ بہت ہی کم لوگوں کی تحویل میں ہوں۔ لیکن مثبت افلاقی اقدار کی عوام الناس تک عدم رسائی سے ایک ایسا خلا پیدا ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے جسے ہم ایک طویل ہرزخ کا نام دے سکتے ہیں اور جس سے باہر نکلنے کے لیے ایک شعوری جدوجہد کی ضرورت ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی تصانیف میں ارغوان حالی، اسوہ حسنی، دیوان غالب کا نسخہ، حمید اور تعلیم و تہذیب خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ غالب اور اقبال پر ان کا مکمل کام اور دیگر بہت سے قطعات اور مضامین کے علاوہ چند سربراوردہ انگریزی شعرا پر ان کے مضامین بھی ہیں۔ یہ سب کچھ انھیں مشرق اور مغرب کے ادب پر ایک مسئلہ اٹھا بی بنا دینے کے لیے کافی ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں کے سیاسی خیالات کچھ بھی ہوں۔ لیکن وہ ماضی کی صحت مند روایات کے بڑے دھنچ دار وکیل تھے۔ وہ صحیح معنوں میں سسرُفانِ شبستان میں سے ایک تھے۔

حامد علی خاں

حمید احمد خاں کی لفظی تصویر

اسلامیہ کالج لاہور کے "حبیبیہ ہال" میں ۲۵ مارچ ۱۹۷۷ء کو پروفیسر حمید احمد خاں کی یاد میں جو جلسہ منعقد ہوا، اُس میں اُن کے بھائی 'حامد علی خاں' نے حسب ذیل تقریر کی :-

جناب صدا! — خواتین اور حضرات! —

نصف صدی سے زاید مدت کے بعد آج پھر میں اس قدیم درس گاہ میں حاضر ہوا ہوں، جہاں برسوں پہلے میں نے ایک بے فکر اور خوش باش نوجوان طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا تھا، اور آج میں ایسے شدید درد و غم کے بوجھ تلے دیا ہوا ہوں، جس کی شدت لمحہ بہ لمحہ شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس وقت دماغ کی کیفیت یہ ہے کہ احباب کی باتیں سنتا ہوں، مگر ان کا مفہوم میرے ذہن میں قائم نہیں ہوتا۔ ایسا ماؤف دماغ کس طرح، اور کہاں سے وہ طاقت لائے کہ اس پر جو گزری ہے، اُس کی کیفیت آپ سے بیان کر سکے۔

میں نے جب کل اس جلسے میں شرکت کا وعدہ کیا تھا، تو مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ مجھ سے کسی تقریر کی توقع بھی رکھی جائے گی۔ میری غرض صرف یہ تھی کہ اسلامیہ کالج کے اس جلسے میں ضرور شریک ہوں، جو میرے چھوٹے بھائی کی یاد میں منعقد ہو رہا ہے۔ یہ اسلامیہ کالج جس کا میں قدیم طالب علم ہوں، حمید احمد خاں، یہاں کچھ مدت طالب علم کی حیثیت سے بھی رہے اور ایک طویل زمانہ انھوں نے استاد کی حیثیت سے بھی گزارا۔ اس کالج سے اُن کا تعلق مجھ سے زیادہ رہا ہے۔ میں نے چاہا کہ میں بھی یہاں آؤں اور کچھ وقت اُن کی یاد میں یہاں بیٹھ کر آپ کے ساتھ گزاروں، مگر آج صبح اخباروں میں اپنے نام کے ساتھ تقریر کا لفظ دیکھ کر میں پریشان ہوا، کہ میں نے کسی تقریر کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ اور اب تو یہ مضطر طور پر میرا وعدہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ اب میں اسے کس طرح پورا کروں؟

حمید احمد خاں میرے بھائی، اور دوست، اور ایک ساتھ کھیلے ہوئے رفیق تھے۔ مدتوں ہمارا لکھنا پڑھنا بھی ایک ساتھ ہوتا رہا۔ وہ مجھ سے کچھ چھوٹے تھے، مگر ہمارے تعلقات میں قریب قریب ہم عمری ہی کی کیفیت رہی، اور میں نے بھی اُن سے بہت کچھ حاصل کیا۔ آج صبح میری پریشانی میں پھر انھیں کی روح میری مدد کو پہنچی اور اُس نے مجھے آپ سے تھوپی شرمساری سے بچا لیا۔

جب وہ "جامعہ پنجاب" کے وائس چانسلر تھے، اُن دنوں یونیورسٹی کے خزانے میں اُن کا ایک مختصر سا مضمون

چھپا تھا۔ وہ پیر الیشی طور پر استاد تھے۔ ان کے دل میں اپنے استادوں کا بہت احترام تھا، اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے شاگرد بھی انھیں کی طرح اپنے والدین اور استادوں کا احترام کریں۔ آج صبح جیسے القا ہوتا ہے، ان کا وہ مختصر مضمون دفعۃً میرے ذہن میں روشن ہوا اور میں نے سوچا کہ شاید اسی کے درلیعہ سے میں کوئی بات کر سکوں۔

اُس مضمون میں حمید احمد خاں نے بتایا تھا کہ عمر بھر جب انھیں کوئی مشکل پیش آئی، انھوں نے اپنے والدین کے طریق کار کو اپنے لیے دستور العمل سمجھا۔ وہ براہ راست والد مرحوم کے متعلق بہت کم جانتے تھے۔ کیونکہ ان کی وفات کے وقت حمید احمد خاں کی عمر چھ سال سے بھی کم تھی۔ لیکن ہم دونوں اپنی والدہ ماجدہ سے اور دوسرے بزرگوں سے والد مرحوم و معذور مولانا سراج الدین احمد خاں کی صفات حسنہ کا ذکر سنتے آئے تھے اور ہماری کوشش رتی تھی کہ ہم کوئی ایسی حرکت نہ کریں کہ ہم ان کی روح سے شرمسار ہوں۔ مجھ سے کہیں زیادہ حمید احمد خاں ان کی پیروی میں کامیاب ہوئے۔ جامعہ پنجاب کے خزانے میں حمید احمد خاں نے طلبہ کو یہی ہدایت کی تھی کہ وہ کسی نہ کسی بلند کردار بزرگ کو اپنا روحانی رہنما قرار دے لیں، جس طرح خود انھوں نے والد مرحوم کی روح اور ان کے کردار کو اپنا رہنما بنایا تھا۔

آج صبح نوبے کے قریب مجھے برادرِ معظم مولانا ظفر علی خاں کے لکھے ہوئے اُس مرثیہ کا دوسرا بند یاد آیا، جس میں مولانا نے جنوری ۱۹۰۹ء میں والد مرحوم کے اوصاف حمیدہ کی تصویر کشی کی تھی۔ مجھے آج یوں محسوس ہوا کہ یہ مرثیہ حمید احمد خاں کی بھی تصویر ہے۔ یہ تصویر میں آپ کو پیش کروں، تو یقیناً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے۔ کہ یہ حمید احمد خاں کی تصویر ہے اور آپ کو یہ اندازہ بھی ہوگا کہ وہ والد ماجد کے کردار کو اپنا نصب العین بنانے میں کس قدر کامل طور پر کامیاب ہوئے۔

واضح رہے کہ یہ اشعار میرے نہیں ہیں۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا یہ مرثیہ ہمارے برادرِ اکبر مولانا ظفر علی خاں نے والد مرحوم و معذور کی رحلت کے موقع پر ۱۹۰۹ء میں لکھا۔ اور یہ والد مرحوم کے جاری کردہ اخبار ”زمیندار“ میں چھپا تھا۔ میں اس مرثیہ کا دوسرا بند آپ کو سناتا ہوں۔ آپ حضرات سے بہتر حمید احمد خاں سے کون واقف ہے۔ آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ حمید احمد خاں کی بھی ہو، لفظی تصویر ہے سے

وہ اپنے فن میں ملک کے اندر یگانہ تھا
حکم قضا سے چارہ نہیں ہے مگر ابھی
ہمت کے اعتبار سے تھا ہمسرِ فلک
اُس کے قلم پہ ختم تھیں جادو نگاریاں
تھی اُس کے لاگ میں بھی ادا اک لگاؤ کی
اُس کی زباں ہمیشہ رہی ترجمانِ دل
ان صاف گوئیوں کی بدولت تمام عمر
طبیع غیور دی تھی خداوند نے اُسے
نیت میں راستی تھی، ارادے میں تھا خلوص

یکتاے روزگار و وحید زمانہ تھا
ہیمانہ اُس کی عمر کا پورا بھسرا نہ تھا
یوں دیکھنے میں گرچہ قد اُس کا میانہ تھا
ہر نقطہ اُس کا ایک دل آفاں تھا
اُس کے سوا یہ رنگ کسی اور کا نہ تھا
اُس واسطے کبھی وہ کسی سے دبا نہ تھا
جب تک کہ چاہیے تھا، وہ اتنا بڑھانہ تھا
آگے کبھی کسی کے سر اُس کا جھکانہ تھا
اُس کے کسی خیال میں شامل ریا نہ تھا

رکھتا وہ دشمنوں کی طرف سے نہ تھا عناد
وہ بے کسوں کے واسطے بنتا رہا سپہر
کی آکے اُس نے غیب سے اُس قوم کی مدد
اُس قوم بے زباں کی بنا آکے وہ زباں
وہ پاک نفس تھا غرض اپنی مثال آپ
ذکر اُس کا آج خلق میں یوں غائبانہ تھا

شہبازِ ماہ پریدہ روہ آسمان گرفت
مُرخ نہ رفته است کہ دیگر تو اں گرفت

ابن انشا کا تازہ ترین سفرنامہ

ابن بطوطہ کے تعاقب میں

ایران، لنکا، لندن، یاپرس، جرمنی، جاپان، فلپائن
اور ہانگ کانگ کے سفروں کا حاصل شگفتہ شگفتہ رواں دواں
کارلٹونز سے مڑین، آفسٹ طباعت، کپڑے کی جلد، خوبصورت
گرد پوش شایع ہو گیا ہے۔ قیمت ۱۵ روپے

ابن انشا کے دوسرے سفر نامے

چلتے ہو تو چین کو چلیے	۶ روپے	(طبع سوم)
آوارہ گرد کی ڈائری	۱۲ روپے	(طبع دوم)
دنیا گول ہے	۱۲ ½ روپے	(طبع دوم)
اردو کی آخری کتاب	(طبع دوم)	اردو مزاح کا شاہکار

تمام کتابیں نہایت خوبصورت تحفے میں دینے کے قابل

دکٹوریہ چیمبرز (۲) صدر کراچی ۳
فون ۵۱۱ ۸۵۷

مکتبہ دانیال

بیگم اکبر علی تور

میرا پیارا بھائی

پروفیسر حمید احمد خان

ذیل کا خط پروفیسر حمید احمد خان مرحوم کی چھوٹی بہن بیگم اکبر علی تور نے اپنے جان سے پیارے بھائی کی رحلت کی اطلاع دینے کے لیے اپنے بیٹے ڈاکٹر عارف اکبر علی تور کو لکھا ہے۔ عارف لیبا میں ڈاکٹر ہیں۔ مرحوم انھیں اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ عارف کو بھی اپنے ماموں سے والہانہ محبت اور عقیدت تھی۔ وہ جنوری ۱۹۶۴ء میں اپنے عزیزوں سے ملنے پاکستان آئے تھے۔ ۴/ فروری ۱۹۶۴ء وہ لیبا واپس چلے گئے۔ عارف کو نصرت کرتے وقت مرحوم نے اپنے بھائی سے کہا تھا کہ "عارف! تم نے بڑا ہی نیک کام کیا جو آکر ہم سے مل لیے۔ تمہارے دوبارہ پاکستان واپس آنے پر میں تو یقیناً زندہ نہیں رہوں گا۔ مرحوم کے یہی الفاظ ہیں جو بیگم تور کو ٹر پار ہے ہیں اور ان سے زیادہ شاید عارف کو ٹر پائیں گے۔ یہی احساس ہے جس نے بیگم تور سے یہ خط لکھوایا ہے۔ خط ایک درد انگیز اور دل گداز مثنوی ہے جو بہن نے بھائی کی جدائی کے غم میں لکھا ہے۔

بیگم اکبر علی تور وہی محترم خاتون ہیں جن کے کئی افسانے ہمایوں میں ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء کے درمیان ز۔ ب کے نام سے چھپے اور بہت پسند کیے گئے۔

۳۷۔ جی گلبرگ

سورخہ ۲ مارچ ۱۹۶۴ء

برہم نہ یہ بزم شادمانی ہوتی اے کاش نہ ختم یہ کہانی ہوتی
اے کاش سدا قرار گل کو ہوتا اے کاش بہار جاودانی ہوتی

میرے یتیم بچے عارف! خدا تم کو اس صدمہ عظیم کو برداشت کرنے کی قوت عطا کرے۔ السلام علیکم۔
 آٹھوے بارہ دن کی سوچ بچار کے بعد اپنے مفلوچ دل و دماغ پر بوجھ ڈال کر اپنے شکستہ دل کے ٹکڑوں کو بڑی
 مشکل سے جوڑ کر تمہیں اپنی پرالم زندگی کا نیا المیہ سنائے کی جرأت کر رہی ہوں۔ جس کا ایک ایک نلفظ میرے خون کے
 آنسوؤں میں ڈوبا ہوا ہے۔

میرے پیارے بیٹے! میں نے تمہارے بچپن میں تمہیں کتنی دلچسپ اور نصیحت آموز کہانیاں سنائی تھیں اور
 ڈراؤنی کہانیاں سے تمہیں بچایا تھا۔ مگر آج جو کہانی لاہور سے بیٹھ کر تمہیں لیا میں سنارہی ہوں۔ بڑی ہی اذیت
 ناک، بڑی ہی درد انگیز ہے اور بے حد دردناک انجام پر ختم ہوتی ہے۔ یہ کہانی تمہارے پیارے ماموں پر فیض حمید احسان
 کے آخری سفر کی کہانی ہے۔ وہ میرے جان سے پیارے بھائی تھے جن کی سلامتی کی دعائیں مانگتے میں نے ایک عمر گزار
 دی۔ میرے مشفق بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ میرے بچپن کے رفیق، میرے ساتھ کھیلے ہوئے ہم جولی اور محترم استاد
 بھی تھے، مجھ بے علم کو ہر قسم کے علم سے شناسا کرنے والے۔ اردو کے علاوہ انگریزی کے بہترین مصنفین کی دلکش تصانیف
 لکھنؤ سناتے، اپنے علم کا پتھر مجھ جیسی آن پڑھ کے کالوں میں ڈالتے، بشکپیئر، کیٹس، بائرن، شیپلے، ورڈز ورثہ اور
 دنیا کے ہر بڑے مصنف، ہر بڑے شاعر کا کلام گھول گھول کر مجھے پلاتے۔ یہیں جھنجھوڑ بھنجوڑ خواب غفلت سے جگا کر
 اقبال اور غالب کا کلام سناتے والا عظیم استاد آج "غالب روڈ" ہی کے قبرستان کا دائمی مقیم بن گیا۔

اوپر لکھی ہوئی باتیں تو کسی پرانے عہد کی یاد ہیں۔ مگر اب بھی عمر کے اس دور میں بھی میری زندگی کی ہر مشکل میں سنیہ
 میرا ہونے کا بار بار دہرایا جاتا ہے۔ جس کا نئے میں بھی میرا دامن الجھ رہا ہوتا، بڑے پیار سے جھک کر اسے میرے دامن سے نکال
 دیتے۔ میں بد نصیب ان کی کون سی بات یاد کروں اور کون سی بھول جاؤں؟ میری ہر خوشی میں مجھ سے دس گنا خوش ہونے
 والے میری ہر پریشانی اور مصیبت کو مجھ سے دس گنا زیادہ محسوس کر کے میرے ہر دکھ کا مداوا کرنے والے، میرے بچوں
 سے مجھ سے بھی زیادہ محبت اور شفقت کرنے والے، اپنے لائق، فائق، بچوں کے مقابلہ میں صرف اپنی محبت سے ہمیشہ
 میرے بچوں کو اور بچاؤ دے عطا کرنے والے، فقیروں، غریبوں، گھر کے لوگوں، معذوروں اور بوڑھوں سے یکساں
 دلی احترام اور دلی محبت سے پیش آنے والے! آہ وہ نشان دار شخص جس سے سارے لاہور کا وقار قائم تھا۔ آج سارے
 پاکستان میں اُس عظیم راہنما، اُس قائد اعظم کے قدموں کے نشان پر چلنے والے درویش صفت راہبر کا ماتم برپا ہے، جس
 کے پاک قدموں سے، جس کے پیر نور سر ابا سے اکثر اور بار بار میرے تاریک اور تنہا گھر میں روشنی کی کرنیں پھوٹ پڑتی تھیں۔
 بابے اب میں کس کے انتظار میں اپنا دروازہ کھلا رکھوں گی؟ آہ ظالم موت نے، بے رحم تقدیر نے اُسے جلدی جلدی اپنے
 کام ختم کرتے دیکھ کر اُسے اپنی سنگین گرفت سے بچ نکلتے دیکھ کر آخر اپنا تیر چلا دیا۔ پل بھر میں اُن کا رناموں پر جنہیں
 سرعت سے وہ پورا کر رہا تھا، جھپٹ پڑی، پل بھر میں وہ خوش و غرم گھرانہ جو ایک خوش نما چمن زار تھا، جس میں آسے
 دن دوستر اور عزیزوں کے لیے وسیع دسترخوان بچھتے تھے اس پر ایک دم اپنی تاریک آندھی چلا دی، پل بھر میں
 معصوم بچوں سے دنیا کی سب سے بڑی دولت اُچک کر انھیں حیران و سرگرداں، تنہا زندگی کی راہ پر چھوڑ دیا۔ اُن کی
 جنت اُن سے چھین کر اپنے بھیمانگ دامن میں چھپی۔ پل بھر میں اُن کی بھولی بھالی لاڈلی، ہر گزینی پر جان دینے والی

بیوی کے سارے رنگ چھین کر چل دی۔ ہائے میں کس سے پوچھوں، ان رنگوں کو بکھیر کر اس ظالم کو کیا ملتا؟
 آہ مجھے اخباروں میں اپنے نوجوان بھائی کی عمر کا حساب لکھا دیکھ کر دل میں تیر لگتا ہے شاید کوئی اس عمر میں بوڑھا ہو جاتا ہو۔ مگر وہ تو آخر دم تک ایک نوجوان لڑکے کی سی زندہ دلی اور تیز رفتاری سے دوڑ بھاگ کر رہے تھے۔ زندگی کی کٹھن راہوں پر ایک شوخ لڑکے کی طرح موت کے تعاقب سے بچ نکلنے کے لیے چھلانگ پر چھلانگ لگا رہے تھے۔ آخری لمحوں تک کیا زندگی کا رکھ رکھاؤ، کیا گھر کے کام، کیا لباس کی ایک ایک سلوٹ کی فکر، کیا بچوں کو خوش کرنے کے لیے تفریح کے پروگرام، کیا ان کے امتحانوں کی تیاری کرائے کی مصروفیت، کیا اپنی نادان قوم کو راہ راست کی طرف کھینچ لانے کے پُر عزم ارادے! وہ جوان تھے جو ان ہمت تھے اور جوان ہی چلے گئے۔ آخری لمحہ تک بھی جب تک ہوش نے کام دیا ان کے آخری الفاظ غائب ہی تھے۔ وقار میرا انتظار کرو، میں دفتر جانے کے لیے تیار ہوں۔ چند ہی لمحے قبل سیرت النبیؐ پر اپنا مضمون دہرا رہے تھے، جو شام کو ریڈیو کے لیے ریکارڈ کرنا تھا، آہ وہ شام جو پھر کبھی ان کی زندگی میں نہ آئی۔ اے میرے خدا ان کتابوں، ان کارناموں کا کیا ہوگا، جو میرے جوان ہمت بھائی کے پیش نظر تھے۔ ان کے ماتمی جلسوں میں اپنے مفیولوج دل و دماغ سمیت اپنے آپ کو گھسیٹ کر شامل ہوئی اور اس محرومی کا احساس اور شدت سے بڑھ گیا کہ اب کوئی شخص ان کو بصورت الفاظ میں، ان کی دل کی تہ میں اتر جانے والی پیاری، کڑک دار آواز سے بول ہی نہیں سکتا۔ بڑے بڑے مقررین نے آنسو بہاتے ہوئے ان کی یاد تازہ کی، مگر میں باغ بہشت کی ٹھنڈی شبنم میں ڈھلے ہوئے۔ وہی الفاظ، وہی نایاب انداز تقریر سننے کے لیے گوشن برآواز رہی۔ جی چاہتا تھا مائیکروفون کو ہٹا کر خود کھڑی ہو جاؤں اور چیخ چیخ کر ان کے سوگوار دوستوں کو بتاؤں کہ انھوں نے کیسا لعل بے بہا کھو دیا ہے۔

عارف خدائے کو سلامت رکھے یہ کہانی بڑی لمبی ہے اور تمھاری ماں اگلا درد انگیز باب سنانے کی تیار نہیں رکھتی۔

آہ!۔۔۔ اب ستارہ نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے میرا قلم خود لکھنے کے لیے تھام لیا ہے۔ اس سے پہلے پاکستان کے تمام ماتمی اخبار اس نے ہی تم کو بھیجے تھے۔۔۔ خدا حافظ!۔۔۔

”امین“ کے بعد رنعت سلطان کی چونکا دینے والی
 نظموں اور غزلوں کا مجموعہ

○ ”آواز“ ○

زیرِ طبع

باہر پبلشرز، دربار حضرت سلطان باہو، ضلع جھنگ

بیگم تور کی صاحبزادی اور ڈاکٹر عارف کی بہن —

جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان

ایک اور شمع خاموش ہو گئی

(تقریر جو ۲۵ مارچ ۱۹۷۷ء کو اسلامیہ کالج لاہور کے تعزیتی اجلاس میں کی گئی)

جیسا کہ ابھی ہمارے دوست نے ارشاد فرمایا مجھے یہ سعادت نصیب ہے کہ میں مرحوم حمید احمد خاں کے ساتھ اسکول میں ہم جماعت تھا۔ اس کو تقریباً ساٹھ برس سے اوپر ہو چلے ہیں۔ اس وقت سے جو رفاقت قائم ہوئی، وہ عمر بھر قائم رہی اور اب موت کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔ ان کی ہم کاری مجھے اور مقامات پر بھی نصیب رہی۔ مثلاً یونیورسٹی میں مجلس زبان و فتری میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ میں، مرکزی اردو بورڈ میں، مجلس ترقی ادب میں، بزم اقبال میں، اتنے اداروں کے ساتھ تعلق رکھتے ہوئے، ان کو میں قریب سے دیکھ سکا۔ میرا یہی تاثر ہوا کہ وہ جس کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں، اُسے مخلصانہ انداز سے اتنے انہماک سے کرتے ہیں کہ رشک آنے لگتا ہے۔ کام کی لگن میں وہ اپنی صحت کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ بارہا میں نے ان سے کہا کہ آپ دو پہر کے کھانے کے بعد قیلولہ ضرور کیا کریں۔ آپ کام زیادہ کرتے ہیں۔ اس لیے آپ بیمار ہونے لگتے ہیں، تو کہنے لگے، کبھی فرصت کم ہے اور کام زیادہ۔ میں نے ان سے ہر چند عرض کی کہ

کار دنیا کسے تمام نہ کر د

آپ صحت کو خراب کر کے کام سے عہدہ برآ نہیں ہو سکیں گے۔ لیکن بہر حال ان کا ایک اصول تھا۔ آخری دم تک انھوں نے جس شغف اور انہماک کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے۔ وہ ہمارے نوجوانوں کے لیے ایک اُسوۂ حسنہ ہے۔ ایک شمع فروزاں ہے۔ جس کی روشنی میں وہ اپنی زندگی سنوار سکتے ہیں۔ حمید احمد خاں کی موت ایک عالم اور ادیب کی موت ہے۔ ایک شفیق استاد کی موت ہے۔ ایک دردمند مخلص انسان کی موت ہے اور ایک دردمند محب وطن پاکستانی کی موت ہے۔ ان میں یہ سب خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ ان تمام کاموں سے اس لیے بخیر و خوبی عہدہ برآ ہو سکے کہ انھوں نے جیسا کہ جسٹس انوار الحق صاحب نے فرمایا، اپنی اصول پرستی کو کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔

کار و بار زندگی میں کسی لگی بیٹی رکھنے کے وہ قائل نہ تھے۔ ریا اور منافقانہ انداز کبھی ان کے نزدیک تک نہ گیا۔ چنانچہ جس سے اختلاف ہوا اسے بر ملا اور بالمشافہ بیان کیا اور یہ نہیں کیا کہ اگر اختلاف ہوا ہو تو اسے چھپا کر خود منافقانہ انداز اختیار کر لیتے۔ اس قدر خوبیوں کے مالک کا جب انتقال ہو جائے تو یہ ایک فطری امر تھا کہ تمام آنکھیں اشک بار ہوں اور دل سوگوار۔ ایک صاحب کا مقولہ ہے کہ انسانی عظمت کا معیار یہ ہے کہ اُس نے ہم عہدوں کو کس حد تک

جسٹس ایس اے رحمن

افکار

ایک اور شمع خاموش ہو گئی

متاثر کیا۔ اس معیار کی روشنی میں دیکھا جائے تو جیسا کہ جسٹس انوار الحق نے فرمایا ان کی زندگی بڑی کامیاب زندگی تھی۔ اُن کے ہم عصروں نے اُن سے جو اثرات لیے وہ نہایت شان دار تھے۔ اُن کے کردار کے متعلق، ان کی سیرت کے متعلق اُن کے اخلاق کے متعلق اُن کے انہماک اور خلوص کے متعلق اور ان کی شفقت اور محبت کے متعلق۔ یہ ایک بڑی بات ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سعدی علیہ الرحمۃ کے وہ اشعار ان پر صادق آتے ہیں جس میں انھوں نے کہا تھا ہے

یاد داری کہ وقتِ زادین تو
ہمہ خنداں شو مند تو گریاں
آنچنان زری کہ دقتِ مردن تو
ہمہ گریاں بدند تو خنداں

اُن کی موت پر کون سی آنکھ تھی جو اشک بار نہ تھی، ان کے غم میں کون سا دل تھا جو سو گوار نہ تھا۔ ایک مرحوم دوست کے حضور ان کی موت پر خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے دل بھی بھرا آتا ہے اور آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں۔ جذبات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ حمید احمد خان کی موت کے ساتھ پُرانے شعلہ آغماہوں کی صف میں ایک اور کمی واقع ہو گئی ہے۔ دایرِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی، ایک اور شمع خاموش ہو گئی۔ اُن لوگوں میں سے اب چند ہی باقی رہ گئے ہیں جنھوں نے تحریکِ پاکستان کے اولین ایام دیکھے تھے اور جو اُس جذبہ و ولولہ سے آشنا ہوئے تھے جس نے تحریکِ پاکستان کو جنم دیا۔ اللہ کرے کہ ہمارے نوجوان بھی اسی شمع سے اپنے چراغ روشن کریں جو حمید احمد خان نے جلائی تھی، تاکہ وہ اپنی قوم اور ملک کے مفید شہری ثابت ہو سکیں اور مخلص مسلمان بن سکیں۔

اللہ کریم سے دعا ہے کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ہم سب کو توفیق دے کہ ہم ان کے نقشِ قدم پر چل کر، انھیں حقیقی خراجِ عقیدت ادا کر سکیں۔ آمین —

نئے افسانے میں

ایک عظیم اضافہ

○ "بیزار آدم کے بیٹے" ○

رشید امجد کے افسانوں کا مجموعہ، جو نئے

افسانوں کے ارتقاء کا پرتو ہیں

قیمت — پندرہ روپے

دستاویز پبلشرز — بک سنٹر حیدر آباد روڈ — راولپنڈی

جسٹس انوار الحق

ایکے باکرہ دار شخصیت

(تقریر جو ۲۵ مارچ کو اسلامیہ کالج لاہور کے تعزیتی اجلاس میں کی گئی)

صدر محترم! خواتین و حضرات —

انسانی زندگی کی یہ معراج اور منزل ہے کہ وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ میرے نزدیک وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو عزت و آبرو سے اُس منزل تک پہنچتے ہیں۔ حمید احمد خاں مرحوم اُن برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک ہیں جو نہایت عزت و آبرو سے اپنی منزل تک پہنچے ہیں۔ گو آج ہمارے دل اُن کی جدائی کے غم میں نڈھال ہیں اور جذبات سے لبریز ہیں اور اُن کے ساتھ طویل رفاقت کی یادیں اُمڈ کر چلی آ رہی ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ وہ واقعی ایک خوش قسمت انسان تھے۔ کہ آخری دم تک اُن کو اپنے نیاز مندوں کی عقیدت حاصل تھی۔ آپنوں کی محبت اور ہر قسم کے جذبات اور نیک تمنائیں اُن کے ساتھ تھیں، اور جس عزت و آبرو سے اُن کے چاہنے والوں نے انھیں پرسوں رخصت کیا ہے اس کا منظر ہم سب کے سامنے ہے۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا اُن پر یہ خاص فضل و کرم تھا کہ وہ اس دنیا سے اس شان سے اٹھے ہیں کہ واقعی اُن پر رشک آتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جتنا اُن سے تعلق رہا، جتنی طویل رفاقت تھی، آج دل اُن یادوں کے بوجھ سے دبا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے اسلامیہ کالج اولڈ لڈ انڈیا سوسی ایشن نے آج اس محفل کا انتظام کر کے ہم سب کو شکر یہ کا موقع دیا ہے کہ ہم اپنے جذبات کا اظہار کر کے اپنے دلوں کا بوجھ کم کر سکیں۔

حمید احمد خاں صاحب سے میری نیاز مندی کی ابتدا اسی کالج میں ہوئی اور جیسا کہ ابھی سکریٹری صاحب نے کہا کہ میں اس کالج میں ایم۔ اے اے اقتصادیات میں داخل ہوا۔ مرحوم چونکہ اس مضمون کے استاد نہ تھے، بلکہ وہ انگریزی کے ایک لڑکھانہ استاد تھے۔ تو ان سے جو میرا تعلق اور نیا زمندی کا سلسلہ شروع ہوا تو آج چالیس سال کے بعد بھی اُسی طرح قائم رہا۔

اُس زمانے میں اسلامیہ کالج کی ایک منفرد حیثیت تھی اور میں اپنے آبائی وطن جالندھر سے جب ایم۔ اے کے داخلے کے لیے لاہور پہنچا تو گورنمنٹ کالج بھی موجود تھا۔ ایف۔ سی کالج بھی موجود تھا۔ لیکن اس کالج کی روایات اور کالج کے اُس وقت کے پرنسپل علامہ یوسف علی اور باقی اُستادوں کا وہ مقام تھا، اور اُن کی وہ شہرت تھی کہ میں

اسی کالج میں داخلہ لینا مناسب سمجھا، اور آج تقریباً ۳۷، ۳۸ سال گزر جانے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کا یہ ایک سرمایہ ہے کہ میں اس کالج میں ایم۔ اے کی تعلیم کے لیے داخل ہوا۔

پروفیسر حمید احمد خاں اُس وقت ایک نوجوان استاد تھے اور ان کے حلقہ احباب میں اس زمانے کے چند شاگردوں میں سب سے پیش پیش حمید نظامی مرحوم تھے۔ مولانا عبد الستار نیازی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اور م۔ ش۔ اور ہم ایسے چند اور پروفیسر فیاض محمود اور ڈاکٹر باقر اس زمانے میں یہاں تھے۔ ان تمام کا مل کر خود ایک ایسا حلقہ بن گیا تھا کہ آج تک، اگرچہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم میں سے بہت سے دوستوں کو چھین لیا ہے اور باقی ہم جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ لیکن اُس زمانے کی یاد آج تک تازہ ہے اور ان روایات کا ایک حصہ پروفیسر حمید احمد خاں تھے۔

جب ان کے شاگرد ان کی فضیلت کا ذکر کرتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مناسب ہے۔ کہ اس وقت اس پس منظر کو بھی سامنے رکھا جائے کہ یہ اس ادارے کی ایک منفرد خصوصیت تھی۔ کہ اس میں ایسے استاد تھے۔ جو اللہ اور رسول کی محبت سے سرشار تھے اور ان کے دلوں میں اس بات کا جذبہ اور شوق تھا کہ جو نوجوان طالب علم اس ادارے میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ان کے دلوں میں بھی محبت اور اخلاق حسنہ کی پیروی کو ان کی زندگی کا لائحہ عمل بنایا جائے گا۔ حمید احمد خاں صاحب اپنے شاگردوں سے اور ہم نوجوانوں سے جو ان کے براہ راست شاگرد نہ تھے۔ لیکن ان کے حلقہ اثر یا حلقہ عقیدت مندی میں آچکے تھے۔ یہ ان کا سب سے بڑا کمال تھا۔ کہ وہ اپنے علم و فن اور فضیلت کے ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں میں اس بات کا جذبہ پیدا کرتے تھے کہ زندگی کی راہ میں سب سے اہم بات ایک مسلمان نوجوان کے لیے یہ ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کو سمجھے اور ان پر عمل کرے۔ حمید احمد خاں صاحب کی اپنی زندگی جو ہم سب کے سامنے ہے۔ اس بات کی ایک زندہ مثال تھی۔

میں نے جیسا عرض کیا، میری نیاز مندی کا سلسلہ اس کالج میں شروع ہوا۔ اس کے بعد مجھے ان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع اُس وقت ملا جب کہ میرے کچھ بزرگوں نے مجھے اسلامیہ کالج کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا۔ سالہا سال تک پروفیسر حمید احمد خاں صاحب جب اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے اور میں کالج کمیٹی کا صدر تھا تو تقریباً ہر بیسے میں دو چار میٹنگیں ایسی ہوتی تھیں اور ایسے متنازعہ فیہ مسائل پر بحث و تجویز کا موقع ملتا تھا جس سے اس شخص کے کردار کی عظمت، اس کے حوصلے کی چنگلی اور اس کے افکار کی بلندی کا پتہ چلتا تھا۔ اور یہ حکومت کی طرف سے ان کی قابلیت اور ان کے علمی تجربے کا ایک اعتراف تھا کہ انھیں یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ اور پھر یہ میری خوش قسمتی سمجھیے کہ یونیورسٹی سنڈیکیٹ کا ممبر ہونے کی حیثیت سے مجھے پھر ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اور ایک مرتبہ پھر میں نے ان کی عظمت کا مشاہدہ کیا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں اور نہ وقت ہے کہ کیا کیا مشکلات پیدا ہوئیں۔ حکومت کے ساتھ کئی قسم کے ٹکراؤ ہوئے، طالب علموں سے سامنے ہوئے، اور سنڈیکیٹ میں خود ہر قسم کی مخالفت کے باوجود حمید احمد خاں نے کبھی اصول پرستی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

اگر مجھ سے یہ کہا جائے کہ ان کی شخصیت کی منفرد خصوصیات کا ذکر کروں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ بطور انسان، بطور

دوست یا بطور اُستاد کے اُن کی شفقت اور اُن کا خلوص سب سے پہلے دل میں اُبھرنا ہے۔ ذاتی تعلقات میں انسان اُن کے اوپر مکمل طور پر اعتماد کر سکتا تھا اور کبھی انسان کو یہ خطرہ لاحق نہیں ہوتا تھا کہ اگر میں نے کوئی اپنا راز خان صاحب سے کہہ دیا، یا اپنی کوئی کمزوری بیان کر دی تو کسی ایسے وقت میں یہ کہیں اس چیز سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں خواہ تین د حضرات آپ اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ ہم جس معاشرے سے گزر رہے ہیں اُس میں سب سے زیادہ نقصان اور تکلیف اپنے دوستوں سے ہی پہنچتی ہے کیونکہ وہ ہماری کمزوریوں کو پہچانتے ہیں اور ہماری اُن تمام کوتاہیوں سے پوری طرح سے واقف ہوتے ہیں جو ہم نے دوستی کے پردے میں کبھی اُن سے بیان کی ہوں یا اُن کے مشاہدے میں آئی ہوں۔ تو حمید احمد خاں صاحب ایک ایسی ہستی تھے کہ اگر وہ آپ کے دوست ہیں، وہ آپ کے ملنے والے ہیں تو خواہ کچھ بھی ہو جائے کسی کمزوری اور کسی کوتاہی کا اگر اُن کو علم ہے تو اُس سے کبھی آپ کو کوئی ناجائز نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اور ساتھ ہی دوسری صفت یہ تھی کہ خواہ آپ سے کتنی ہی دوستی ہے، کتنا ہی تعلق ہے، لیکن اگر آپ کا کوئی مطالبہ ناجائز ہے، اگر آپ نے کوئی ایسا فعل کیا ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہے تو پھر حمید احمد خاں میں یہ جرأت تھی کہ وہ خاص طور پر آپ کو کہہ دیں کہ میرے بھائی میں اس معاملے میں آپ کی معاونت اور امداد نہیں کر سکتا کیونکہ یہ آپ نے غلطی کی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر آپ مجھ سے مشورہ مانگتے ہیں تو اس میں آپ کو جو نقصان ہوئے دلاست اُس میں کچھ کمی کی جاسکے۔ لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ میں ناجائز طور پر آپ کی امداد کروں تو یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ یہ میرے نزدیک ایک ایسی چیز تھی جو آہستہ آہستہ مفقود ہوتی چلی جا رہی ہے اور جتنا بھی اس خصوصیت کو عزت اور احترام سے دیکھا جائے کم ہے۔ بحیثیت اُستاد کے اُن کے علم و فضیلت اور اُن کی شفقت کا ذکر اُن کے شاگرد کر چکے ہیں۔ اُس میں مجھے کچھ اضافہ کرنا مقصد نہیں ہے۔ لیکن اُن میں اُصول پر چلنے کی جرأت اور حق بات کہنے کی ہمت اللہ تعالیٰ نے کوٹ کوٹ کر ودیعت کی تھی۔ اور اگرچہ میں کسی پہ اعتراض کرنا نہیں چاہتا اور میرے نوجوان دوست یعنی طلبہ مجھے معاف کریں۔ لیکن میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یونیورسٹی میں جب طلبہ نے نظم و ضبط کا دامن چھوڑ دیا اور انھوں نے AGITATION کرنا اپنا حق سمجھا یا اپنا شعار بنالیا تو اُس زمانے میں ایک موقع ایسا آیا کہ یہ نوجوان اپنی بے راہ روی میں حمید احمد خاں صاحب انسان کے کبھی خلاف اُٹھے اور ایک موقع پر میں سمجھتا ہوں کہ رحمان صاحب اُس سے پوری طرح واقف ہوں گے اور کچھ اور آپ حضرات بھی جانتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے والٹر چائسلر کے دفتر پر دھوا بول دیا تھا۔ حمید احمد خاں صاحب اپنے دفتر میں کام میں مصروف تھے تو یہ لوگ دروازہ کھول کے بے محابہ کمرے میں داخل ہوئے اور کچھ نوجوان بدتمیزی سے اُن کی میز کے اوپر چڑھ گئے اور اُن کو ایک — THREATENING انداز میں جیسے کہ وہ ابھی اُن کو مارنے والے ہیں یا اُن کا گلا گھونٹنے لگے ہیں اُن کی طرف بڑھے اور کہا کہ ہمارے مطالبات آپ کو ماننے پڑیں گے۔ تو اُس وقت اس شخص نے جو جسمانی طور پر اُن کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا، عمر میں ان سے بہت زیادہ تھا، جسمانی طور پر اُن سے کمزور تھا تو اُس شخص نے اُن کی طرف دیکھا اور کہا میری ساری عمر آپ نوجوانوں کی خدمت میں گزاری ہے، اور اگر میرا خاتمہ بھی آپ کے ہاتھوں میں ہے تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔ جب یہ بات انھوں نے کہی تو وہ نوجوان جو میرے چڑھ کر اُن کو دھمکا رہے تھے وہ میرے اُتر آئے اور نادام و شرمندہ ہو کر باہر نکل گئے۔

مجھے یہ بات اسی شام کو پتہ چلی تو میں نے ان سے جب اس کی تصدیق کرنا چاہی تو کہنے لگے "نہیں وہ میرے اپنے بچے تھے کوئی بات نہیں۔ ایسی بات ہو جاتی ہے، تو گزارش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو اخلاقی جرات اور ہمت اور حوصلہ اس انداز سے دیا تھا کہ وہ اپنے اصولوں کی خاطر سچائی کی خاطر اور اس کام کی خاطر جس کو وہ جاننا اور ضروری سمجھتے تھے وہ کسی سے دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور ان میں اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی اخلاقی کمزوری پیدا نہ کی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے دوسرے بھائی بندوں سے دبتے۔

حمید احمد خاں کی زندگی ایک ایسی مثال ہے کہ جو ہمارے نوجوانوں کے سامنے بیان کی جائے، اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس بیان کرنے سے بہر حال آج کی محفل میں، میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اولڈ بوائز ایسوسی ایشن یہ مناسب سمجھے تو سال بھر میں ایک دن اس کے لیے محفل کر دیں، تاکہ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی صفات نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے بیان کی جائیں۔ خاں صاحب مرحوم ہماری تعریف یا ہماری عقیدت کے محتاج نہیں۔ انھوں نے آسمانوں میں اپنا ایک مقام اپنے کردار سے پیدا کیا ہے۔ تمام زندگی میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس منزل کی تیاری کرتے رہے، جہاں وہ پرسوں پہنچے۔ اُن کا کردار اُن کا اخلاق، اُن کے فعل اور اُن کے افکار تمام اس بات کے غماز تھے کہ ہر لحظہ اُن کو اس بات کا احساس تھا کہ اپنے خالق حقیقی کے سامنے پیش ہونا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اللہ اور رسول کے احکام کی پیروی کی۔ انسانوں کے حقوق پوری طرح سے ادا کیے۔ اپنے دوستوں سے محبت اور شفقت کا سلوک کیا اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہم اپنے ذہنوں میں اُن تمام ۳۵، ۴۰ سال کے واقعات کی یادیں اپنے سامنے لاکے بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن الفاظ میں یہ قدرت نہیں ہے کہ ہم اپنے جذبات کو پوری طرح سے بیان کر سکیں۔

میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُن کی اہلیہ محترمہ اور اُن کے بچوں کو ہمت اور صبر عطا کرے، اُن کو اس بات کا اطمینان ہونا چاہیے کہ اُن کے لیے اُن کے عزیز مشیر اور اُن کے والد کے لیے لوگوں کے دلوں میں اس قدر عزت و احترام کے جذبات ہیں جو کہ آج کل کے زمانے میں ویسے ہی مفقود ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اُن کے پاس اس وقت نہ کوئی طاقت تھی، نہ اثبات تھے۔ لیکن اُن کی ذاتی محبت اور شرافت تھی کہ آج ہزار ہا آدمیوں نے اُن کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اور یہ انسان کی خوش قسمتی ہے کہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ اس منزل پر پہنچے۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے اور ہمیں اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

کوئٹہ

میں کتب و رسائل کا خوبصورت مرکز

گوشہ ادب

متصل ریگل سینما کوئٹہ۔ فون ۶۰۰۲ ۵۶۸۱

پروفیسر تاضی محمد اسلم

پروفیسر حمید احمد خاں

(چند یادیں چند باتیں)

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی ناگہانی وفات پر بہت کچھ لکھا گیا۔ اور کہا گیا ہے۔ لیکن ابھی اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اور لکھا جانا چاہیے۔ جو دوست اپنے اوقات کو خدمت قوم و ملک میں دیانت، لیاقت، اور محنت سے صرف کرتے ہیں۔ اُن کا ذکر قوم کو زندہ رکھتا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کا یہی مقام تھا اور یہی کام۔

نظم و نسق اور منصوبہ بندی میں دوستوں کے حقوق اور اُن کے اختلافات، (بعض اوقات نہایت تلخ اختلافات) کے متعلق فیصلہ کرنے میں مصروف رہتے ہوئے دفتری اوقات کی سختی سے پابندی کرتے ہوئے بڑے بڑے لوگ۔ اپنی نرم مزاجی اور آداب و اخلاق کو کھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن حمید احمد خاں کا یہ حال نہ تھا، جن اخلاق کو لے کر وہ دنیا میں آئے جن کی پرورش دنیا میں رہ کر انھوں نے پیہم کی۔ وہ آخری وقت تک اُن پر مہال بنی فایم رہے۔ اُن کی مرکزی صفت شرافت تھی جس سے وہ سب کا دل موہ لیتے تھے، ہاں انصاف کے تقاضے اُن میں تلخی بھی پیدا کرتے تھے، لیکن اُن کی اس تلخی میں بھی شرافت ہوتی تھی۔

دوسری بڑی صفت

دوسری صفت اُن میں اُستاد اور اُستاد کے پیشے کے لیے ایک گہرا اور ان مرٹ احترام تھا۔ ایک دفعہ اُستادوں کی تنخواہوں اور اُن کے لیے عام مراعات اور سہولتوں کا ذکر آیا۔ تو پوری پوری ہمدردی رکھنے کے باوجود اُن کا موقف یہ تھا کہ تنخواہیں بڑھیں یا نہ بڑھیں۔ مراعات ملیں یا نہ ملیں۔ وہ کچھ بھی مدرسوں سے یہی کہیں گے کہ وہ اپنا کام کرتے جائیں اور کبھی بدول نہ ہوں اور حکومت سے ناراض نہ ہوں۔ کیونکہ ایک مدرس کا کام کچھ نرالی قسم کا ہے۔

یہ کام اتنا خوش گوار اور اتنا بلند ہے کہ اس کا اجر تو خود اس کے کام ہی سے مل جاتا ہے۔ ہاں اُستاد کو کام کرنے اور آمادہ رکھنے کے لیے ہر سامان معائنہ اور حکومت کو کرنا چاہیے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں، تو وہ ذمہ دار ہیں اُستاد کا کام پھر بھی یہ ہے کہ قربانی دے اور کام کرتا رہے۔

والٹس چانسلر کا عہدہ تعلیمی دنیا میں بلند ترین عہدہ ہے۔ جب ایک مدرس اس عہدے پر پہنچ جائے، تو اس میں درس و تدریس کے چیلن پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور افسروں والے اخلاق اور دفتری روایات کے اثر کے ماتحت نئے قسم کے اخلاق اور آداب اور طور طریقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن نہیں۔ یہ بات حمید احمد خاں میں نظر نہیں آتی۔

وہ استادوں، پیرائے رفقاءے کار اور علمی کام کرنے والوں کا اسی طرح احترام کرتے رہے۔ اور ان کا وہی متوقع اور نامل نسیم کا احترام کرتے رہے، جو وہ خود استاد ہونے کی حیثیت سے اور کچھ کالج کا پرنسپل ہونے کی حیثیت سے کرتے رہے۔ اس میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا۔ اُستاد کی حوصلہ افزائی اور اس کی عزت نفس قائم کرنے کا اس سے بہتر کیا طریق ہو سکتا ہے۔

ایک اور کمزوری

استادوں اور علمی مذاق رکھنے والے اور علمی کام کرنے والے افراد میں ایک اور کمزوری ہوتی ہے۔ یہ کہ وہ انتظامی کاموں اور فائلوں سے کراہت کرتے ہیں اور اپنے اس کام کو بکلی دوسروں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور خود کو دوسروں کے کچے ہوئے کو منظور کرنے کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ لیکن حمید احمد خاں نے فائلوں پر ہمیشہ توجہ اور محنت کی نگاہ رکھی اور کیا رفتار کے لحاظ سے۔ کیا نگرانی کے لحاظ سے، کیا انصاف اور تعین حقوق کے لحاظ سے اپنے کام کا معیار ہمیشہ اونچا رکھا۔

جب وہ والس چانسلر بنے تو یہ خاکسار شعبہ فلسفہ کا ہیڈ تھا۔ پہلا ہیڈ اور پروفیسر۔ قارئین جانتے ہیں کہ پاکستان میں فلسفہ کی تدریس میں اقبالیات کا ایک خاص مقام ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں منصوبہ بندی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور خیال ہوا۔ کہ جب تک کوئی معین اسکیمیں ترتیب نہ دی جائیں گی۔ اقبالیات کا حق ادا نہ ہوگا۔ اتفاق سے ایک کمپن پروفیسر سیاحت کرتے ہوئے انہی دنوں پاکستان پہنچے۔ ان سے تبادلہ خیالات ہوا۔ وہ کسی ادارے کی طرف سے بھیجے ہوئے نہ تھے۔ سیاحت تھے۔ اور انھیں مشرقی تحریکوں سے مشرقی شاعری اور مشرقی افکار سے خاص شغف تھا۔ اُن سے مشورے ہوئے۔ اور ان مشوروں کے نتیجے میں کچھ ایسی اسکیمیں تیار ہوئیں۔ جن سے اقبالیات کو فروغ حاصل ہو سکتا تھا۔ خود پاکستان میں اور پاکستان سے باہر۔

اقبال کے اعزاز میں سالانہ لیکچروں کا سلسلہ شروع ہوا۔

چنانچہ پہلے لیکچروں کے لیے میاں ممتاز حسن کو منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد سے اقبال لیکچروں کا سلسلہ یونیورسٹی کے سالانہ فرائض میں داخل ہو گیا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا۔ کہ اقبال کے مشہور ”خطبات مدارس“ کے لیے حواشی تیار ہونے چاہئیں۔ جو خاص طور پر مغربی قارئین کے لیے مفید ہوں۔ ضروری حوالہ جات بھی لگائے جائیں۔ اور اس کتاب کو عام و خاص کے لیے مفید تر بنادیا جائے۔

یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اقبال کے منظوم کلام کا انگریزی ترجمہ نئے انتظام اور نئے اہتمام سے ہو ٹھیک ہے اقبال کے منظوم کلام کے تراجم موجود ہیں۔ لیکن ضروری تھا کہ پاکستانی اہل قلم۔ کلام اقبال کی روح کو جاننے والے اور انگریزی میں درست رس رکھنے والے اس میدان میں نکلیں۔ اچھے کلام کے اچھے تراجم کی کوئی حد نہیں۔ نئے تراجم کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے اور اب تک تو سوائے چند ایک کے بیشتر تراجم غیر مسلموں اور غیر پاکستانیوں کے کیے ہوئے تھے۔ ایک مجلس مشورہ میں یہ خاکسار بھی موجود تھا۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے ماہرانہ دانشمندانہ طریق سے بحث کو چلایا۔ نکلتے کے ترجمہ کی افلاطون کے باوجود اس کے اسلوب کو باقی تراجم سے بہتر قرار دیا گیا۔ اور فیصلہ ہوا کہ ترجمہ انگریزی نشریں ہو۔ لیکن ایسی نشریں جو نظم کا رنگ رکھتی ہو، اور جس میں روح کلام بہر حال مقدم ہے۔

انسوس یہ پراجیکٹ سنورٹ شدہ تکمیل ہے!

ایک باقاعدہ اور بامروت انسان

پروفیسر حمید احمد خاں بامروت انسان تھے۔ عدل سے اوپر سب سے احسان کا معاملہ کرنے کی تمنا رکھتے تھے۔ لیکن احسان کر کے بھی ممنون احسان کو محسوس نہ ہونے دیتے تھے کہ انھوں نے کسی کے لیے کچھ کیا ہے۔ کسی بات کا وعدہ کر لیا پس ایک ہی دفعہ کافی ہوتا تھا۔ یاد دہانی کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اپنے وعدے نوٹ کر کے رکھتے تھے۔ اور وقت آنے پر اُن کو حتی الوسع پورا کر دیتے تھے۔ اور کبھی جتاتے نہ تھے۔ جن کے حق میں وعدے ہوتے تھے وہ خود حیران رہ جاتے تھے کہ کس طرح اپنی زبان کی بات یاد رکھتی اور وقت آنے پر پوری کر دی۔

ایک نفسیاتی وصف

پروفیسر حمید احمد خاں کا ایک وصف نفسیاتی لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہے اور کئی دوسرے افسروں کے لیے مثال۔ وہ ہر ملاقاتی کی بات خوب توجہ سے سنتے۔ بات کسی کی ذاتی ہے۔ تعلیم کے کسی مسئلے کے متعلق۔ دین و ملت۔ یا سیاست کے متعلق جسے انگریزی میں "گڈ لسنر" (GOOD LISTENER) کہتے ہیں۔ وہ اس کی مکمل مثال تھے۔ ملاقات کرنے والا تسلی پاتا اور وہ خود ذہنی، علمی۔ اخلاقی اور روحانی لحاظ سے اپنے آپ کو پہلے سے بلند تر مقام پر لیتے۔ اللہ اللہ یہ درویشی اور یہ سادگی اور ذوق اور یہ بے خودی!

میں یونیورسٹی سے فارغ ہو کر رتبہ کالج کا پرنسپل مقرر ہوا۔ رتبہ میں ایم۔ اے عربی کی کلاس کا میا بی شے شروع ہو چکی تھی۔ اور اب کالج کا پلان یہ تھا کہ آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے سب سائنسوں اور سب آرٹس میں ایم ایس سی اور ایم۔ اے کی کلاسیں جاری ہو جائیں۔ میرے جانے پر فزکس ایم۔ ایس سی کا مسئلہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے نوٹس میں نہ چکا تھا۔ اور ہوا یہ تھا۔ کہ یونیورسٹی کے ایک کمیشن نے رپورٹ یہ کر دی تھی کہ رتبہ میں ایم۔ ایس سی کھولنے کا کوئی جواز نہیں۔ نہ اس وقت نہ آئندہ کس وجہ سے؟ اس وجہ سے کہ:۔۔۔

۔۔۔ رتبہ میں زمین شورہ آلودہ ہے۔

۔۔۔ یہاں جو عمارت نئی ہے چند سالوں میں بوسیدہ ہو جاتی ہے۔

۔۔۔ آبادی کم ہے۔ یعنی صرف ۱۴ ہزار کے قریب

۔۔۔ اعلیٰ تعلیم کا ماحول ہنوز ندارد

۔۔۔ تفریح کے سامان غنقا۔ وغیرہ وغیرہ

میرے یہ بڑی مشکل تھی کہ اب اس مجسمہ بلکہ مردہ مسئلہ کو پھر سے کیسے زندہ کیا جائے۔ نظریہ پروفیسر حمید احمد خاں کی معقول پسندی پر پڑی۔ سب سے پہلے اُن کو اس بات کا قائل پایا کہ۔۔۔ سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے سامان۔۔۔ سارے کے سارے۔ لاہور ہی میں جمع نہ ہونے چاہئیں۔ بلکہ صوبہ کے اور مراکز میں بھی جہاں مناسب اور ممکن ہو۔

کھوے جائیں۔ اس کے بعد اُن کو اس بات کا قائل پایا کہ۔

اگر ہم یونیورسٹی کی تمام معقول شرائط پوری کر دیں تو ہمیں ایم۔ ایس۔ سی کا الحاق مل جائے گا۔ چنانچہ طے پایا کہ۔ یونیورسٹی ایک نیا کمیشن مقرر کرے۔ وہ موقع پر پہنچ کر تمام ضروری شرائط کی ایک فہرست مرتب کرے۔ سامان کیسا ہو؟ کمرے کتنے ہوں؟ کتابوں کا ذخیرہ کیسا ہو؟ اسٹاف کس لیاقت کا اور کتنا ہو؟ کوئی تحریری گارنٹی یونیورسٹی کی طرف سے نہ مل سکتی تھی نہ ملی۔

بس زبانی شریفانہ قسم کا معاہدہ ہوا۔ جس روز ہم یونیورسٹی کی مرتب کردہ فہرست شرائط پوری کر چکیں تو یونیورسٹی کو اطلاع دے دیں۔ جس پر یونیورسٹی کمیشن پھر رپورٹ آئے اور تسلی کرے کہ شرائط پوری ہو گئیں۔ یا قریباً قریباً پوری ہو گئیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہر مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوا۔ کسی ایک قدم پر بھی کوئی الجھن پیدا نہ ہوئی۔ نہ ہمیں بھاجت کرنی پڑی۔ نہ ہم پر کوئی احسان جتایا گیا۔ ایک کام جو معقول طور پر ہو جانا چاہیے تھا۔ شرائط پوری ہونے پر بغیر جیل و حجت ہو گیا۔ اور رپورٹ میں ایم۔ ایس۔ سی فزکس جاری ہو گئی۔ اور اب وہ صوبے بھر میں ایک دیکھنے والا ادارہ ہے۔ لیکن کس انسان کی شفقت۔ اور کس کی نظر کا نتیجہ؟

حمید احمد خاں کی شفقت اور۔ حمید احمد خاں کی نظر کا۔

یہ اُن کے بے شمار کاموں میں سے فقط ایک کام تھا۔ جسے انھوں نے اپنے فرائض منصبی میں سے ایک فرض سمجھ کر ادا کیا۔

واہ رے زور شرافت خوب دکھلایا اثر

باتیں تو کئی لکھنے والی ہیں۔ لیکن کہاں تک لکھتے جائیں۔ میں نے انھیں طلبہ سے ملتے اور باتیں کرتے بھی دیکھا۔ اس میں کوئی بناوٹ نہ ہوتی تھی۔ طلبہ سے شفقت اُن کا شیوہ تھا۔ لیکن اصول کی بات وہ کسی لحاظ یا کسی طعنہ سے یا کسی کے دباؤ سے چھوڑنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ اور یہ مسلک اُن کا طلبہ کے تعلق ہی میں کام کرتا نظر نہ آتا تھا۔ بلکہ اپنے سے بالا حکام سے معاملہ کرتے وقت بھی اور اپنے برابر کا درجہ رکھنے والوں سے بھی اُن کا یہی طریق تھا۔

خدا مغفرت فرمائے۔ واقعی بہت سی خوبیاں تھیں حمید احمد خاں میں۔

عبد اللہ علیم کا

پہلا نمائندہ مجموعہ کلام

چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں

شایع ہو گیا۔ بہترین گیت اپ۔ قیمت ۵ روپے

ناشر: سیپ پیبلی کیشنز کراچی

احمد ندیم قاسمی

پروفیسر حمید احمد خاں

تہذیبی قدروں کی زندہ علامت

پروفیسر حمید احمد خاں کی رحلت سے لاہور شرافت، شفقت، شائستگی اور ایمان داری کے ایک محبوب پیر سے محروم ہو گیا ہے۔ وہ ایک ماہر تعلیم تھے۔ ایک محنتی استاد تھے اور ایک باوقار والس چانسٹر تھے، مگر ان کی ان سب اہم جہتوں پر بھی ان کی انسانیت بھاری تھی۔ وہ ان تمام تہذیبی اور مجلسی قدروں کی ایک زندہ علامت تھے جن کی توانائی سے آج کا معاشرہ محروم ہوتا جا رہا ہے۔ راتے با اصول استاد اور ایسے درد مند انسان آج کل نظروں سے ذرا کم ہی گزرتے ہیں۔ اس پر مستزاد ان کی حق گوئی، اور بے باکی تھی جن کی وجہ سے قدم قدم پر انھیں مخالفتوں سے بھی ساقبہ پڑا، مگر ان کی راست بازی اس معیار کی تھی جو کوئی ایسا سمجھوتہ نہیں کر سکتی جس سے راستی پر زبرد پڑتی ہو۔

پروفیسر حمید احمد خاں اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے علم و ادب اور سیاست سے یہ خطہ ارض صدیوں صدی سے متاثر ہو رہا ہے۔ آپ مولانا ظفر علی خاں مرحوم و مغفور کے چھوٹے بھائی تھے دوسرے دونوں بھائی بھی علم و ادب میں ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ پروفیسر محمود احمد خاں کے علمی تجربہ کا ایک زمانہ قائل ہے اور مولانا حامد علی خاں نے اردو ادب و فن کی جو بے شمار خدمات انجام دی ہیں، ان کے بھی ہم سب معترف ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے علمی تحقیقی اور ادبی مشاغل ساری عمر جاری رکھے، مگر ان کا بیشتر وقت تعلیم و تعلم ہی میں گذرا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف کی تعداد بہت کم ہے۔ اب آخری عمر میں وہ اپنے منشر مضامین کو یک جا کر رہے تھے اور اپنے محبوب موضوعات۔ غالب و اقبال۔ پر کتابیں لکھ رہے تھے۔ افسوس کہ ان کی اچانک موت سے یہ کتابیں نامکمل رہ گئیں۔ مگر ان نامکمل مسودات کو بھی شایع ہو جانا چاہیے، کیونکہ ان میں بھی تحقیق و تنقید کے ایسے ایسے جواہر پارے موجود ہوں گے جن سے آئندہ نسلوں کی رہنمائی ہوگی۔ دراصل پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم جس طرح بچے تلے انداز میں بولتے تھے، اسی طرح بچے تلے انداز میں لکھتے تھے۔ ان کے ہر جملے کا باقاعدہ ایک علمی پس منظر ہوتا تھا اور وہ اپنے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کی ذمہ داری قبول کرتے تھے۔ مرزا غالب کے سلسلے میں انھوں نے جس انداز میں داد و تحسین دی اس کے سلسلے میں ان کی لگن اور سیاضت کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ آج کل ان کا محبوب موضوع علامہ اقبال، ان کا فن اور ان کا فلسفہ تھا اور ان کے قریبی دوستوں کا کہنا ہے کہ علامہ پر انھوں نے جو کتاب شروع کر رکھی تھی وہ مکمل ہونے پر اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافے کا موجب بنتی۔ چنانچہ ہماری استدعا ہے کہ ان نامکمل مسودات کی اشاعت کا فوراً ہندوستان ہونا چاہیے۔

اس طرح ان بے بدل تحریروں کو بھی بقائے دوام حاصل ہوگی اور ہمارے تہذیبی سرمائے میں بھی قابل قدر اضافہ ہوگا۔
مرحوم سے مجھے اتنا ذاتی قرب تو حاصل نہیں تھا کہ میں ان کے معمولات اور ان کے مزاج و کردار کی جزئیات کے بارے میں اعتماد سے کچھ کہہ سکوں، مگر مجھ سے وہ ہمیشہ نہایت شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے۔ اس زمانے میں انھیں کچھ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں لاہور کے اہل علم کی ایک کمیٹی کے اجلاسوں کی صدارت فرماتے تھے۔ مجھے بھی اس کمیٹی میں شمولیت کی عزت حاصل تھی، چنانچہ ان محفلوں میں جہاں مولانا غلام رسول نہر، ڈاکٹر سید عبداللہ، شیخ محمد اکرام، سید وزیر الحسن عابدی اور ڈاکٹر اجمل کے سے اہل علم کے مہذب معیار بحث سے مستفید ہونے کا موقع ملا، وہیں پروفیسر حمید احمد خاں (کہ اس مجلس یادگار غالب کے صدر تھے) کی گفتگو سنی اور اندازہ ہوا کہ انگریزی کے اس پروفیسر کو اردو زبان سے اور اردو زبان کے اتنے بڑے شاعر سے کتنی بے پناہ محبت اور عقیدت ہے۔ اس مجلس یادگار غالب نے صد سالہ برسی کی تقریب پر جو کچھ کیا، وہ پنجاب یونیورسٹی کی پوری تاریخ کا ایک قابل فخر واقعہ ہے۔ متعلقہ مطبوعات کا معیار اعلیٰ درجے کا ہے اور انھیں اتنی نفاست کے ساتھ مرتب اور طبع کیا گیا ہے کہ ہر کتاب پر پروفیسر حمید احمد خاں کی نفاست طبع اور شائستگی کی دل آویز شہرت نظر آتی ہے۔ ابھی یہ کام تکمیل پذیر نہیں ہوا تھا کہ ملک کے سیاسی حالات کے تحت اور مرحوم کی اصول پسندی کے باعث انھیں یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ کو چھوڑنا پڑا۔ مگر ان کے بعد علامہ علاؤ الدین صدیقی نے یہ منصب سنبھالا تو پروفیسر حمید احمد خاں کے کام کو جاری رکھنے کا عزم کر لیا۔ چنانچہ انہی کے دور میں غالب کی متعدد تصانیف اور اس کے متعلق یہ کتابیں چھپ کر تیار ہوئیں۔ ان کے بارے میں پروفیسر حمید احمد خاں کے یہ الفاظ بہت اہم مضمرات رکھتے ہیں کہ:-

”یہ کتابیں فروری ۱۹۶۹ء میں شایع ہو رہی ہیں۔ گویا ان کی تاریخ اشاعت سے مزا غالب کی حیات بعد ممات کی دوسری صدی شروع ہوتی ہے، مجلس کو یقین ہے کہ اس دوسری صدی میں غالب کے قبول عام کی سرحدیں کچھ اور وسیع ہو جائیں گی۔ خدا کرے کہ دنیا کو ہندوستانی تمدن کے آخری ترجمان سے روشناس کرائے میں مجلس کی یہ سچی رائے گمان نہ جائے“

مجھے ایک اور واقعہ کبھی نہیں بھولے گا۔ یہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دن تھے۔ لاہور پر بھارتی ہوائی جہازوں کے حملے شروع ہو چکے تھے اور دن میں دن دہشت منیہں مرتبہ سائرین کی آوازیں گونجتی تھیں۔ ایک پرجوش نوجوان کونہ جانے کیا سوچی کہ اس عالم میں انھوں نے اہل قلم کا ایک جلوس لگانے کا پروگرام بنایا۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستانیوں کے عزم باخیزم کا دنیا کے سامنے اعلان کیا جائے۔ یہ مقصد نیک تھا۔ اس لیے میں بھی اس جلوس میں شرکت کرنے ناصر باغ پہنچ گیا۔ کچھ دیر میں پروفیسر حمید احمد خاں بھی پروفیسر سید وقار عظیم کی معیت میں تشریف لے آئے۔ پھر ڈاکٹر محمد باقر بھی آنکلیے مگر خاصی دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی جب مزید اہل قلم تشریف نہ لائے، تو پروفیسر حمید احمد خاں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں ایک جلسہ کر کے اور ایک قرارداد منظور کر کے جلوس کے پروگرام کو ملتوی کر دیا جائے۔ کیونکہ چار اہل قلم کا جلوس کچھ بھلا نہیں لگتا۔ سمجھی نے اس تجویز کی تائید کی مگر جلوس کے منتظم کو شاید عزت نفس کا شدید احساس تھا انھوں نے کہا کہ کم سے کم آپ چاروں اس جیپ پر سوار ہو کر فرلانگ دوفرلانگ تک تو چلے چلیں کہ کچھ بھرم رہ جائے۔ ناچار ہم چاروں اس جیپ میں جا کھڑے ہوئے اور جیپ چلا دی گئی۔ آس پاس کے لوگوں نے یہ

منظر دیکھا تو ساتھ ہو لیے اور جی۔ پی او تک اس ہجوم نے باقاعدہ ایک جلوس کی صورت اختیار کر لی۔ اس روز پروفیسر حمید احمد خاں کا غصہ بھی دیدنی تھا اور بے بسی بھی۔ غصہ اس بات پر تھا کہ اہل قلم کہوں نہ پہنچے اور اگر نہ پہنچ سکے تو انھیں شارع قائد اعظم پر کیوں تماشا بنایا جا رہا ہے۔ اور بے بسی یہ کہ وہ چلتی جیب سے چھلانگ نہیں لگا سکتے تھے۔ آخر سب نے طے کیا کہ اوکھسی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر۔ جو تقریر کر سکتا ہے وہ تقریر کرے اور جو نظم سنا سکتا ہے وہ نظم سنائے۔ چنانچہ پروفیسر حمید احمد خاں سید وقار عظیم اور ڈاکٹر محمد باقر نے تقریریں کیں۔ میں نے نظم پڑھی، ادھر ادھر ہجوم میں مجھے جو بھی شاعر دکھائی دیا، اسے میں جیب میں کھینچ لایا اور اسے نظم پڑھنا پڑی آخر مسجد شہداء کے چوک میں اس ”جلوس“ کو منتشر ہونے کی اجازت ملی۔ اور جب ہم لوگ خان صاحب یا وقار صاحب کی کار میں آکر بیٹھے تو خان صاحب نے دعا مانگی کہ خدا نہ کرے ہمیں آئندہ اس طرح کے واقعے سے سابقہ پڑے۔ وہ تو خبر جو کچھ ہوا سو ہوا۔ مگر اس دوران کا وہ واقعہ ناقابل فراموش ہے جب جلوس نکلنے سے پہلے ایک صاحب نے کہا کہ جلوس کے دوران میں اگر ہوائی حملے کا سائرن بج اٹھا تو ہمارا طرز عمل کیا ہوگا۔ اس پر پروفیسر حمید احمد خاں گرجے۔ ہمارا طرز عمل ہوگا کہ ہم جیب میں کھڑے رہیں گے۔ چاہے ہمارے پرچے ہی اڑ جائیں۔ جیب سے کود کر کوئی پناہ ڈھونڈنا ان لوگوں کو نہیں سمجھا جو اہل ملک کو آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا درس دینے نکلے ہیں۔!

ضروری اعلان

”مجلس یادگار حمید“ نے پروفیسر حمید احمد خاں کے مکاتیب مرتب اور شایع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مرحوم کے عزیزوں اور دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ اس علمی اور ادبی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں اور ان کے پاس مرحوم کے لکھے ہوئے جو خطوط ہوں انھیں بذریعہ رجسٹری مندرجہ ذیل پتے پر ارسال فرما کر اس کا رخیر میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کریں۔

خطوں کے تصویر سی عکس لے کر اصل خطوط بحفاظت واپس بھیج دیے جائیں گے۔

منتظر کرم
سید وقار عظیم

۷-ای۔ بلاک سی

سمن آباد — لاہور

میرے محترم استاد

پروفیسر حمید احمد خاں

آج صبح سے آندھی چل رہی ہے۔ اور مجھے ایک خیال بُری طرح ستا رہا ہے۔ آندھی یا تیز ہوا سے میں بالعموم پریشان نہیں ہوتا۔ ہوا تیز و تند ہو تو اس سے حرکت و عمل کا احساس ہوتا ہے، مگر میری آرزو یہ ہے کہ آج ہوا ختم تھم کر چلے، اس میں گرد و غبار بالکل نہ ہو۔ کچھ دیر کے بعد ہوا کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو جائے، اور کتنا ہی گرد و غبار کیوں نہ اڑنے لگے، مجھے کوئی فکر نہیں ہوگی، اسی وقت تو لازماً فضا کو پرسکون ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ کھٹے آدھے کھٹے کے بعد ایک ایسے شخص کو وادی خاموشیاں کی طرف اپنے سفر کا آغاز کرنا ہے، جس کی زندگی ہمیشہ بے داغ رہی ہے۔ اگر ایسا شخص کا نفس میلا ہو جائے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی، پروفیسر حمید احمد خاں نے کل ۲۲ مارچ کو دوپہر کے بعد اس دنیا میں آخری سانس لیا تھا اور آج ہم جوان کے شاگرد، احباب، عزیزان کے لئے اور پرانے ساتھی ہیں انھیں آخری منزل پر پہنچانے کے لیے ان کی کوٹھی کے وسیع لان میں جمع ہو گئے ہیں۔

وہ میرے استاد تھے۔ ان کے ساتھ میری شاگردانہ عقیدت وابستہ ہے، لیکن کالج سے نکلنے کے بعد میرے اور ان کے درمیان استاد شاگرد کی بجائے دوستانہ روابط قائم ہو گئے تھے۔ جن میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا، ہم دوستوں کی طرح ملتے تھے۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ اس دوستی کی ابتداء بھی انہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ مجھے دور سے دیکھتے تھے، تو خود چل کر میرے پاس آ جاتے تھے۔ اور بے تکلفی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تھے۔ یہ محض ان کی محبت اور شفقت تھی۔ اور اس محبت و شفقت میں ان کا ہر شاگرد برابر کا حصہ دار تھا، کم از کم ان کے رویے سے یہی ثابت ہوتا تھا۔

مجھے پروفیسر حمید احمد خاں کو قریب سے دیکھنے کا بارہا موقع ملا تھا۔ اور کئی بار ان کے دل و دماغ میں جھانکنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میرے استاد مجھے نفاست تھے، تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہوگا، (جلال عباس پٹنہ، صاف ستھری جگہ پر رہنا اگر وہ پیش کے ماحول میں صفائی رکھنا، یہ نفاست پسندی ضرور ہے، مگر بڑی محدود قسم کی میرے محترم استاد میں تو نفاست پسندی کے بے شمار روپ تھے، اور واقعہ یہ ہے، انہیں نفاست پسندی کا ہر روپ بے حد عینیت سے تھا۔

اس قدر عزیز تھا کہ وہ اسے کسی حالت میں بھی مجروح صورت میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی نفاست پسندی کا یہ عالم ہے کہ مرے سے کچھ روز پیشتر وصیت کرتے ہیں کہ ان کے جد خاں کو گلبرگ کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ کیونکہ وہ

صاف ستھرا ہے۔ نفاست کو معنویت کی وسیع تر سطح پر لا کر دیکھیں تو یہ عبارت ہے زندگی کی اُجلی اور داغ دھبے سے پاک اور منزہ قدروں سے۔ یہ نظام قدار پر مشتمل ہے، خلوص، راست بازی، راست گوئی، سلیقہ مندی، بے ریا محبت، نیک بینی، نیک نفسی اور باہمی اعتماد پر کہتے ہیں کہ آرٹ سے زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ مجھے اس نظریے کے تسلیم کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ انسان زیادہ قابل احترام ہے جو آرٹ سے زندگی میں حسن پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی ہی کو آرٹ بنادیتا ہے، اور پروفیسر حمید احمد خان کی زندگی واقعی ایک آرٹ ہے۔ وہ سلیقہ مندی سے زندگی بسر کرنا جانتے تھے، اور انھوں نے بیس تیر برس جو اس دنیا میں گزرے ہیں، آرٹ کی تمام پابندیوں پر عمل پیرا ہو کر گزرے ہیں، ان کے اس آرٹ کا کمال یہ ہے کہ وقت کا جو لمحہ بھی ان کی زندگی کا جزو بنتا تھا، جب ان سے الگ ہوتا تھا تو ان کے سانس کی عطر فشاںی سے نسیم بہار کا جھونکا بن جاتا تھا۔ ایسے لوگ خوشبو میں پھیلاتے ہوئے آتے ہیں اور خوشبو میں پھیلاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

ان کی نفاست پسندی کو اگر کسی مثال کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کروں تو یوں کہہ سکتا ہوں، کہ زندگی کے خوبصورت قالین پر چلتے ہوئے اگر ان کے پاؤں کا ٹپا چھ جاتا تو انھیں پاؤں پر زخم لگنے کا افسوس ہرگز نہ ہوتا۔ افسوس ہوتا تو فقط اس بات کا کہ اس زخم سے نکلے ہوئے لہو کے نظروں نے قالین کی نفاست تباہ کر دی ہے۔

وہ مہر سے پاؤں تک نفاست تھے۔ نفاست میں نرمی اور ملائمت ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھی وہ نرم اور ملائم نہیں ہوتے تھے۔ دیکھنے والے محسوس کرتے تھے کہ وہ سخت ہو گئے ہیں۔ ان کا رویہ کثرت ہو گیا ہے۔ لیکن یہ بالکل عارضی کیفیت ہوتی تھی۔ برف کے تودے پر ہاتھ رکھیں تو وہ کتنا کثرت معلوم ہوتا ہے۔ مگر کچھ لمحوں کے بعد ہی وہ بگھل کر پانی بن جاتا ہے۔ یہی کیفیت پروفیسر حمید احمد خان کی بھی تھی۔ وہ جتنی جلدی گرمی گفتار کا اظہار کرتے تھے اتنی جلدی ملائمت بھی اختیار کر لیتے تھے۔ ان کے اندر تو کثرت تھی ہی نہیں، ان کے باطن میں پنکھڑیوں کی سی لطافت اور شبنم کی سی معصومیت تھی کسی کے ساتھ سخت کلامی سے پیش آتے تھے تو تھوڑی دیر بعد ہی انھیں احساس ہو جاتا تھا کہ ان کی زندگی کے صاف ستھرے دامن پر ایک داغ سا پڑ گیا ہے۔ اور یہ داغ ان کی طبع نفاست پسند کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ گرمی کلام ایک دم ختم ہو کر نرمی گفتار بن جاتی تھی! جس سے اچھٹے تھے اس سے بعض اوقات معافی مانگ لیتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب وہ پہلی مرتبہ ہماری کلاس میں انگریزی کمپوزیشن سکرائے آئے تھے تو طلبہ نے ان کے ساتھ اسی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تھا، جو وہ بہرے پروفیسر کے ساتھ پوری باقاعدگی سے روا رکھتے تھے۔ پروفیسر حمید احمد خان کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا تھا۔ انھوں نے لڑکوں کو مخاطب کر کے خوب ڈانٹ پلائی تھی۔ مگر جب لڑکوں نے خاموشی اختیار کر لی تو ان کے دھڑکے میں ایک ایسی تبدیلی آگئی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اپنی تلخ گوئی پر دکھ ہے۔ اور وہ اس احساس کو ختم کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ کوئی سخت گیر استاد نہیں۔

ٹیوٹوریل میننگ میں وہ میری نظمیں سنتے تھے اور میری ہر طرح ہمت افزائی کرتے تھے۔ ایک بار بھی انھوں نے نہ بتایا کہ وہ علم و ادب کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور خود بھی بہت اچھے افسانہ نگار تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں اس زمانے میں نظمیں لکھتا تھا اور پروفیسر حمید احمد خان افسانے۔ اس دور میں

انھوں نے ایک نہایت خوبصورت افسانہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا، ”مصور“ اور یہ افسانہ ”ہمایوں“ میں چھپا تھا کسی کو بھی یہ بات معلوم نہیں تھی۔ کہ اس افسانے کے مصنف وہی حمید احمد خاں ہیں جو ایف اے کی ایک کلاس کو انگریزی کمپوزیشن سکھاتے ہیں۔ کافی مدت بعد مجھے اس حقیقت کا علم ہو گیا، میں نے جب ان سے مصور کا ذکر کیا تھا، تو انھوں نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر یوں نفی میں سر ہلا دیا تھا جیسے یہ افسانہ انھیں پسند نہیں، اور وہ اس تصنیف سے دست بردار ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ کوئی نفاست خیالی تھی جس سے ان کا یہ افسانہ محروم تھا؟ اس کا بھی انھوں نے ذکر نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ لوگ اسے ایک سرفراز موش گردیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں کی نفاست ان کے خونناہ جگر کی کشیدہ گاہ میں پرورش اور ترتیب پاتی تھی۔ غالبیات سے متعلق کوئی مقالہ، اور غزل کے ارتقائی مراحل پر مبنی کوئی مضمون ہو، دیوان غالب کے نسخہ حمیدہ کا دیباچہ ہو یا خوابہ الطاف حسین حالی کے حیات و کلام کا جائزہ ہو، وہ ہر جگہ ہر مقام پر اسی خون جگر سے آمیز کی ہوئی، نفاست سے کام لیتے تھے۔ انھوں نے بہت کم لکھا ہے، مگر جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے نفاست کے مقررہ معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا ہے، ان کی ساری تخلیقات ضخیم جلدوں سے دامن کشا چند سو صفحات میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ مگر یہی چند سو صفحات ادب کے افق پر چاندنی کا روپ دھارے بڑی نفاست سے بنتی ہوئی ہیں۔

نفاست ان کی پوری زندگی پر حاوی ہو گئی تھی۔ یہ ہر کام میں باقاعدگی، یہ خود کو ہر وقت چست و چو بند رکھنے کی پابندی اسی نفاست پسندی کے مظاہر تھے اور یہ بھی نفاست ہی کا ایک رُخ تھا کہ وہ سٹے پر و گرام میں ایک منٹ کی بے قاعدگی، بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی کو اپنے دفتر میں یا گھر میں پانچ بجے ملنے کے لیے کہا ہو تو آئے وائے کو لازمی طور پر اس وقت ان کے پاس آنا چاہیے، جب گھڑی کی گھنٹے کی سوئی پانچ کے ہندسے پر پہنچ جائے۔ اس میں ایک لمحے کی کمی بیشی بھی انھیں ناگوار ہوگی، یہ الگ مسئلہ ہے کہ دیر سے آنے والے کی پذیرائی بھی کر دیتے تھے۔ گوشکن آلود پیشانی کے ساتھ۔!

تو یہ ہیں پروفیسر حمید احمد خاں۔ میرے محترم میرے شفیق استاد، جنھوں نے نفاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ جنھوں نے نفاست کو گہری معنویت بخشی تھی۔ اور جو آج دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہے ہیں۔ اور مجھے فکر ہے کہ گرد آلود ہوا ان کا کفن میلا نہ کر دے، کوئی اس آندھی کو روک نہیں سکتا۔ کون روکے گا۔ ایک جا پانی شاعر تھا جس نے کہا تھا۔

باغ کے تختے پر لکھا ہے کہ پھول مت توڑو

مگر ہوا یہ بات نہیں پڑھ سکتی....

اور آندھی کو کون سمجھائے کہ تو اس شخص کا کفن میلا نہ کر، اس کی زندگی سہرا نفاست تھی۔

کاش آندھی یہ بات سمجھ سکے۔

افکار — سالانہ ممبرین کر ”ندیم نمبر“
رعایتی قیمت میں حاصل کیجیے

جمیل الدین عسلی

پروفیسر حمید احمد خاں کی یامیں

پروفیسر حمید احمد خاں بھی رخصت ہوئے۔

آخر یہ کیا قصہ ہے۔ آج کل موت کا غلطہ زیادہ ہے۔ زندگی کی آواز کم سنائی دیتی ہے۔ شاید ہم خود زندگی سے دور اور موت سے قریب ہو رہے ہیں۔ اب ہمارا سفر نامہ کتابی صورت میں نہ آئے، دوسرا مجموعہ کلام شایع نہ ہو تو کیا یہ موت کی ذمہ داری ہے۔ زندگی انتظار کر لیتی ہوگی موت نہیں کرتی، کہتے ہیں کہ وہ سخت پٹکچوٹل ہوتی ہے۔

یا ایسے احساسات اس نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ ہیں جو ایسی موتیں پیدا کر دیتی ہیں۔ سچ کہ انسان میں قوت مقابلہ ہونی چاہیے، مگر کہاں تک۔ خاص طور پر جذباتی رشتوں کے معاملے میں تو قوت مقابلہ کا لغو بہت جلد کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ بہت بنے۔ بہت صبر و ضبط دکھائے، بہت اترائے تو آدمی سسکی نظر آئے لگتا ہے۔ آج کل ہم کچھ ایسی ہی آزمائش سے گزر رہے ہیں۔ ہمارا ایک نہایت محبوب دوست ہسپتال میں داخل ہے۔ اللہ اسے اچھا کرے۔ لڑکپن کا یار عباس احمد عباسی مر گیا، تو ہم نے صبر و ضبط کا فراڈ اختیار کیا۔ وہ مشہور صحافی اور کثیر الاہباب آدمی تھا، اس لیے اس پر تعزیتی تحریریں چھپیں۔ ہم فوری طور پر تو کچھ لکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ چند روز بعد بھی اپنے اس کالم میں اس کا ذکر کرنا چاہا تو سیدھے سادے ماتم کی بجائے فلسفیانہ تنازعات میں دھنس گئے۔ دوسرے دن چھپا ہوا کالم دیکھا تو اپنے آپ پر افسوس ہوا۔ نہ اپنا جی ہلکا کر سکے۔ نہ کوئی اور قاعدے کی بات کہہ سکے۔ ہاں اس وقت عباس کی موت پر ہم نے جو شہرت اور ابدیت کے مفروضات کا بھانڈا پھوڑنا شروع کر دیا تھا تو اس کی ایک وجہ بھی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ گلڈ میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا تھا، اس میں محترم سید محمد تقی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے ہمارے لیے ایک رنج دہ بات کہہ دی تھی۔ یہ کہ عباس کی تحریریں اعلیٰ معیار کے مطابق نہیں ہو سکی تھیں جبکہ وہ بہت بہتر لکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ دراصل تقی صاحب اپنی طرف سے اپنی نقادانہ دیانت محفوظ رکھتے ہوئے ایک مرے ہوئے دوست ادیب کے بارے میں تعریفی گفتگو کی رسم پوری کر رہے تھے۔ ایسے جلسوں میں ایسا ہی ہوتا ہے اور ذاتی طور پر ہم ان کے ممنون تھے کہ ہم اپنے چونتیس سال کے دوست سے متعلق کچھ سن ہی رہے ہیں۔ تقی صاحب کی رائے بڑی درست تھی۔ کیونکہ عباس کی الہیتیں واقعی اس کے پروڈکشن سے کہیں زیادہ تھیں !!!

لیکن یہیں سے ہمیں یہ خیال آیا کہ پروڈکشن کیا ہوتا ہے۔ پروڈکشن کی عمر۔ اس کی کوالٹی۔ اس کی پائیداری اس کی عارضیت یا ابدیت کا مسئلہ ہے کیا۔ ابھی تہذیب انسانی پر چھ سات ہزار سال سے زیادہ تو گزرے نہیں اور لوگوں نے اپنی

تسلّی کے لیے عظمتوں کے دلافانیت کے وادیت کے سکے گھر گھر کر رائج بھی کرادیے۔ کچھ یوں بھی محسوس ہوا کہ یہ کیا بات ہوئی کہ تعزّتی جلسے میں تنقیدی گفتگو ہونے لگے۔ حالانکہ تقی صاحب کی گفتگو بنیادی طور سے محبتانہ تھی، مگر بس وہ ایک پھانس ہمارے دل میں لگ گئی۔ وہاں ہم نہ بولے کہ اس وقت جذباتی کیفیت چند فقروں کی متحمل بھی نہ تھی۔ تیسرے دن مضمون لکھنے بیٹھے تو ردعمل نے کچھ اور رخ اختیار کر لیا تھا۔

اب ایک پرانی صداقت اپنی اہمیت یاد دلاتی ہے۔ رنج کرنا ہے تو رنج کی طرح کرو۔ باتو کچھ دل سے یہ کہو اور سمجھو کہ الشرح تیری مرضی۔ بلکہ بعض مضبوط ایمان والے تو موتوں پر الحمد للہ کہتے ہیں۔ لیکن اگر تمہارا مقام اتنا اونچا نہیں تو اپنے طبعی اظہار کو صبر و ضبط اور فلسفہ طرازی کا پابند نہ کرو۔ روؤ۔ چہینہ۔ چلاؤ۔ جو لمحہ جس طرح گزرا ہوا اسے کسی اور بات سے ملتوث کیے بغیر گزرے دو۔ ہاں بعض صورتوں میں بقول جگر مرحوم یوں بھی ہوتا ہے۔

کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

تو ہم عارضی۔ دوامی شہرت اور انسانوں کی ابدیت کا مسئلہ پھر کسی موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ ہم نے اس پر سوچا ہے اور ہم اس پر کچھ عرض بھی کریں گے کہ یہ ایک فکر انگیز موضوع ہے۔ مگر ابھی نہیں۔ جس بات کی فوری تحریک کسی ردعمل سے ہو ممکن ہے کہ محفل اظہار اس پر گفتگو کو خالص اور مضبوط نہ رہنے دے۔

رہا عباس مرحوم تو ہم اب بھی اس پر مضمون نہیں لکھ سکتے۔ اغلب یہ ہے کہ کوئی تیسرا دوست ہم دونوں پر لکھے گا۔ سماجی سطح پر دیکھیے تو پروفیسر حمید احمد خاں کا انتقال ایک قومی سانحے سے کم نہیں ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں انگریزی کے استاد اور اردو کے سپاہی تھے۔ ہم ان کے شاگرد نہیں رہے۔ لیکن تمام عمر انھیں استاد جانا۔ وہ لاہور میں رہتے تھے اور ہم کراچی میں۔ ملاقاتیں زیادہ تر باضابطہ مجلسوں تک محدود رہیں مثلاً گلڈ کی مجلسیں۔ مثلاً مرکزی اردو بورڈ لاہور۔ اردو ترقی بورڈ کراچی۔ انجمن ترقی اردو کچھ دہلی کمیٹیوں میں ساتھ کام کیا۔ کچھ مشاورتی کمیٹیوں میں ان سے فیضیاب ہوئے نجی ملاقاتیں رہیں، مگر زیادہ نہیں انھیں پورے طور پر جاننے کا دعوے نہیں کر سکتے، مگر جتنا جانا اس کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک بڑے آدمی اور خالص پاکستانی المزاج پاکستانی تھے۔

ہمیں خود اچھی اردو بولنے یا لکھنے کا دعویٰ نہیں رہا۔ بلکہ سچ بات یہ ہے کہ ہمارا اپنا مکتب فکر کچھ اور ہی ہے ہم زبان کے معاملے میں محاورہ بازی۔ جگت تذکیر و تائیت وغیرہ کے مسائل کو بالکل اہمیت نہیں دیتے۔ فقروں کی تراش خراش۔ زیبائش غرضیکہ انشائیت کی کوئی خاص تکریم نہیں کرتے۔ زبان کے معاملے کسی سابق یا حالیہ صوبے شہر۔ مکتب کے تفوق یا درجہ استناد کے بھی قائل نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ اردو پڑھانے والوں اور مہذبوں کا مسئلہ ہے۔ ہماری رائے میں تاریخی واقفیت سے آگے جا کر ان پر زور دینا مشیخت اور جارحانہ ذہنیت کی باتیں اور سائنسی زبان میں زبان کے لیے مانع ارتقا ہیں۔ ہماری رائے ہمیشہ سے یہ رہی ہے اور کبھی ہماری کوئی تحریر اس رائے کے خلاف غمازی نہیں کر سکتی کہ زبان ہر اس شخص کی ہے جو اسے استعمال کرے۔ یعنی ہر بولنے والا اہل زبان ہے۔ اگر انگریزی آکسفورڈ اور کیرج کے محاوراتی اور تلفظاتی اجارے میں رہتی تو آج امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور دوسرے بہت سے ممالک کی مجموعی جینٹس سے مالا مال نہ ہوتی۔ سنسکرت کی طرح سوکھ کر یاد دماغی ہو چکی۔ مگر یہ ایک بحث ہے اور بڑی سخت بحث، اس وقت

کہنا یہ تھا کہ ہماری پیدائش تو اپنی جگہ مگر ہم نے بڑے بڑے مستند اہل زبان کو بھی سُن رکھا ہے۔ اپنے گئے گزرے زمانے میں بھی دلی کے چار استادوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ بیچود صاحب۔ سائل صاحب۔ پنڈت امر ناتھ صاحب اور پنڈت تربھون ناتھ زار صاحب۔ یہ تو تھے شاء اساتذہ۔ نثر نگاروں میں ایک ہی نام بہتوں پر بھاری ہے۔ یعنی ہم نے خواجہ حسن نظامی صاحب کو خوب دیکھا اور سنا ہے۔ ویسے اور بہت سے نام گنوائے جاسکتے ہیں۔ دلی مرتے مرتے بھی دلی تھی۔ لکھنؤ ہم کبھی گئے نہیں۔ مگر اس زمانے کے دستور میں دلی والوں کو لکھنؤ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

اور ہم نے سر عبدالقادر مرحوم کو دیکھا اور سنا ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام سے گفتگو کی ہے اور کسی حد تک مولانا مہر اویس رشید احمد کی باتیں بھی سنی ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر کے حلقے میں حاضری دی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب بھی ہمارے لیے چشمہ فیض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس پس منظر کے بعد ہم بڑی آسانی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر حمید احمد خاں کی زبان میں تمام پرانی لطافتیں اور تمام جدید توانائیاں موجود تھیں۔ ان کی گفتگو میں وہ سب کچھ جھلکتا تھا جو ہم نے بزرگوں میں دیکھا اور وہ سب کچھ بھی جو ایک زندہ اور پھیلتی ہوئی زبان کا خاصہ ہونا چاہیے۔ واللہ کہ زبان میں وہ ہم دلی والوں سے کہیں آگے تھے۔ ایک عجیب خصوصیت ان کی زبان میں ایسی تھی جو انہی کے بہت سے ہم عصر فضلا میں بھی کم دیکھی۔ وہ اردو میں کبھی انگریزی کے الفاظ یا فقرے استعمال نہیں کرتے تھے۔ اصطلاحوں کی بات اور ہے کہ ابھی اردو میں بے شمار اصطلاحات کے ترجمے زبان پر نہیں آئے۔ سو کبھی کبھار جہاں اصطلاح کی ضرورت ہی آپڑے، وہ انگریزی یا لاطینی کا لفظ استعمال کر لیتے تھے۔ مگر وہ بھی متوازی تشریح کے ساتھ۔ لیکن عام ادائے مطالب میں جس طرح ہم جیسے ہر چند ثانیوں میں دو تین لفظ بلکہ فقرے کے فقرے انگریزی کے اڑا دیتے ہیں اور وہ بھی غلط سلطاً اس سے وہ متبرکت تھے۔ اور اس طرح کہ انھیں اور سننے والوں کو کوئی تکلف بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ان کا تلفظ۔ ان کا لہجہ، ان کا انداز اظہار، ایک ایسے شگفتہ طبیعت، حاضر دماغ، جدت پسند نام جیسا تھا، جسے زبان پر مکمل عبور حاصل ہو۔

اور وہ چالیس برس سے انگریزی پڑھا رہے تھے۔

اردو سے ان کے شغف کا یہ عالم تھا کہ ہم ان سے بہت ہی نیاز مندانہ رابطہ رکھنے کے باوجود ان کی کرم نوازیوں کی بنا پر۔ گستاخی اختیار کرتے ہوئے انھیں اردو کا شدت پسند کہا کرتے تھے۔ وہ ہمارا مذاق برداشت کر لیتے تھے مگر کبھی کبھی ایک آہ ان کے لبوں پر آتی اور کہتے ہاں بھائی مہر اہل عقیدہ کو شدت پسند ہی کہا جاتا ہے۔ حضرت اگر آپ اپنے عقیدے کو سچا سمجھتے ہیں تو یہ شدت پسندی ہی ہونی نا۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہی ہو سکتی ہے۔

ہمیں پروفیسر حمید احمد خاں کے سیاسی عقاید نہیں معلوم نظر ہے کہ ایک سرکاری قسم کے ملازم رہے تھے۔ سیاسی عقیدے کا کھلا اظہار ہم ملا کرتے بھی کیونکر، لیکن ہم نے محسوس کیا کہ ان کی زندگی میں پرانی وضع داری کے باوجود ان کے مزاج میں مثبت اور روز افزوں جدیدیت تھی۔ اپنے بیشتر ہم عصروں کی طرح وہ نئے خیالوں کو سرسری طور سے دُسن نہیں کر دیتے تھے۔ بات سنتے تھے اس پر سوچتے تھے اور جی کو لگے تو اپنی رائے کو وقار کا مسئلہ بنائے بغیر بول دیتے تھے۔

غالب اور اقبال سبھی "شوقینوں" کے محبوب موضوعات ہیں۔ مگر پروفیسر صاحب کی غالب شناسی اور اقبال پرستی بچلے

خود ایک تاج محل کی طرح چمکتی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ غالب و اقبال کے انتخاب اور بر محل استعمال کی ایک نئی روایت تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس روایت کا فیض بہت دور تک نہ پہنچا ہو اور ان کے شہنا سادہ احوال تک محدود ہوں۔ لیکن انھوں نے غالب و اقبال پر بہت کچھ لکھوائے کے علاوہ بہت کچھ خود بھی لکھا۔ غالب کی زندگی پر بھی انھوں نے خاصا کام کیا تھا۔ غالب و اقبال پر کبھی کبھی اپنے مسودات کے کچھ حصے سناتے رہتے تھے۔ افسوس کہ تاحال وہ کتابیں چھپنے کی خبر نہیں آئی۔

جس حد تک ہم نے انھیں دیکھا وہ سخت صلح جو اور محبت پسند بزرگ تھے۔ دو تین معاملاتی مجلسوں میں چند بڑے نام والے بزرگ آپس میں گتھ گئے۔ واک آؤٹ کی لڑت آگئی۔ پروفیسر صاحب صدر نشین تھے۔ انھوں نے عرض و نیاز سے کام نکلنے نہ پایا تو گزر محبت سنبھالا۔ کہا واللہ آپ لوگوں نے یہ حرکت کی تو میں استغفا بھی دوں گا اور بھوک ٹھرتال بھی کروں گا۔ وہ بزرگ حضرت گلے مل لیے پروفیسر صاحب کی آنکھیں بھی ان کی باتوں کی طرح میٹھی تھیں۔ کڑوے سے کڑوا مناقشہ پھل کر شہد ہو جاتا تھا۔

پروفیسر صاحب سے ہماری خصوصی نیاز مندی کا آغاز جناب ممتاز حسن کی معرفت ہوا تھا۔ عجیب المیہ ہے کہ ہم ایک شہر میں رہتے ہیں اور مفتوں مہینوں نہیں مل پاتے، جیسی محبت ہم نے ان دو صاحبوں میں پائی، ہمارے ہم عصروں میں نہیں دیکھی جاتی۔ شاید پروفیسر صاحب مرحوم اور جناب ممتاز حسن صاحب ہم مکتب بھی ہوں، مگر ان کی عمر دوستی ہم مذاقی سے طویل اور محکم ہی۔ علم کی جستجو۔ اہل علم و اہل ادب کی منزلت۔ طالبان علم کی ممکنہ خدمت اپنے بارے میں انکسار اور معاملات و مسائل کو صوبائیت کی عینک سے نہ دیکھنا۔ یہ خصوصیات ان بزرگوں میں مشترک پائیں۔ اور ان خوبیوں کے ورثہ دار کم از کم کراچی شہر میں تو کم ہی نظر آئے ہیں۔

زندہ ملکوں میں قاعدہ ہے کہ جن لوگوں نے علم و ادب کی شان دار خدمات انجام دی ہوں ان کی زندگی میں ہی ایک PRESENTATION VOLUME شایع کی جاتی ہے۔ ایک خاصی ضخیم کتاب جس میں نہ صرف ممدوح کی حیات اور کاموں کا تذکرہ ہوتا ہے بلکہ ان موضوعات پر اعلیٰ درجے کے مضامین شامل ہوتے ہیں جن موضوعات سے ممدوح کو خاص دلچسپی رہی ہو۔ پاکستان میں صرف جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان کو ایک PRESENTATION VOLUME پیش ہوئی مگر اس وقت جب وہ برسرِ اقتدار تھے خیر وہ بھی ایک مبارک فال تھی۔ باقی ہم لوگ زیادہ سے زیادہ ادبی رسائل کے نمبر پر اکتفا کرتے تھے۔ وہ سلسلہ بھی بند ہو گیا تھا۔ ہماری تحریک پر "افکار" کراچی نے حفیظ جالندھری نمبر اور فیض نمبر نکالے اور مدیر "افکار" کی محنت میں کلام نہیں لیکن پھر۔۔۔ بھی دل برداشتہ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ اب ان میں پھر بہت آئی ہے اور احمد ندیم قاسمی نمبر نکال رہے ہیں۔ یہ سلسلہ مبارک ہے مگر بہر حال تخلیقی ادیبوں کا ہے جنھیں لوگ یوں بھی زیادہ جانتے ہیں۔ ایک PRESENTATION VOLUME جناب ممتاز حسن کے لیے شروع ہوئی تھی جب وہ اقتدار سے الگ ہوئے وہ منصوبہ بند بھی غائب ہو گئے۔ اور پروفیسر حمید احمد خاں جیسی شخصیت پر صرف کالم لکھے جا رہے ہیں۔

اے افکار کا حفیظ جالندھری نمبر جناب جمیل الدین عالی کی تحریک اور گلڈ کے تعاون سے راقم الحروف نے شایع کیا تھا اور بس! (صبا)

غالب، گھڑی، اقبال اور پاکستان

غالب، پاکستان، اقبال، اردو زبان، ان چار چیزوں کی آمیزش سے جو نمبر اٹھا، اس سے پروفیسر حمید احمد خاں بنے۔ باقی ایک چیز گھڑی تھی جس نے ان کی زندگی میں بہت عمل دخل پیدا کر لیا تھا۔ جلسہ گاہ میں ایسے داخل ہوتے تھے، جیسے ڈبئی نذیر احمد دلی کی لائبریری میں داخل ہوتے تھے۔ روزانہ کا یہ معمول تھا کہ ادھر گھنٹہ کے گھڑیاں لے ٹن چھ بجائے اور ادھر ڈبئی نذیر احمد لائبریری داخل ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ڈبئی نذیر احمد لائبریری میں داخل ہو گئے۔ مگر گھڑیاں نہ بولا۔ گھنٹہ گھر والے اس پر پریشان ہوئے اور جھٹ پٹ اپنی گھڑی کو درست کیا۔ اور حلقہ ارباب ذوق کا جلسہ اس روز ۴ بجے سہ پہر کو شروع ہونا تھا۔ اور پروفیسر حمید احمد خاں کو صدارت کرنی تھی۔ حلقہ کے ادیبوں نے چار بجے کو کب چار بجے سمجھا تھا کہ آج ہی سمجھتے۔ خاں صاحب نہ ایک سیکنڈ ادھر نہ ایک سیکنڈ اُدھر۔ ٹھیک چار بجے دائی۔ ایم۔ سی اے کے بورڈ روم میں داخل ہوئے۔ کمرے میں آدمی نہ آدم زاد۔ انھوں نے گھڑی کلائی سے کھول کر سامنے میز پر رکھی۔ یوں سمجھیے کہ تلوار نیام سے نکال کر رو برو رکھی۔ پھر حلقہ کا جو منتظم آیا اُس نے خاں صاحب کی گھڑی کو متال شمیر برمنہ میز پر رکھے دیکھا۔ خاں صاحب کے تیور دیکھے اور ہم کر رہ گیا۔ دیسے خاں صاحب کے تیوروں کا معاملہ یہ تھا کہ اوپر سے سخت اندر سے نرم، شہرت بخاری حلقہ ارباب ذوق ادبی کے جلسہ میں بتا رہے تھے کہ خاں صاحب عید کے بعد سلامیہ کالج میں آکر چیرا سبوں کے کوارٹروں پر پہنچے، عید ملتے اور عیدی دے کر آتے۔ ایک برس ایک چیرا سی بیمار ہو کر گاؤں چلا گیا۔ خاں صاحب نے اس کا پتہ معلوم کیا۔ دوسروں نے عید کی عید ہی اسے وہاں بھیجی، دیسے تو سلامیہ کالج چھوڑے ہوئے خاں صاحب کو مدت ہی ہو گئی تھی۔ مگر چیرا سبوں کے ساتھ ان کی وضع داری چلے جا رہی تھی۔

یونٹن جاوید نے مجلس ترقی ادب کے خاکروب کے ساتھ ان کی وضع داری کا قصہ سنایا۔ علامہ اقبال کے جشن پیدائش کا جلسہ جب بخیر و خوبی ہو چکا تو طے ہوا کہ سب عملہ والے مل کر چائے پئیں۔ عملہ کے سب اراکین موجود تھے۔ مگر خاں صاحب کی آنکھیں مجلس کے خاکروب کو تماش کر رہی تھیں۔ اسے بطور خاص بلوایا۔ کہا بھائی تم عیسائی ہونے کی وجہ سے ہمارے ساتھ چائے پینا پسند نہ کرو تو الگ بات ہے، مگر ہمیں تمہارے ساتھ چائے پی کر بہت خوشی ہوگی۔ علامہ اقبال کے جشن پیدائش کا ذکر آیا ہے تو یہ سن لیجئے کہ خاں صاحب اُٹھتے بیٹھتے دو شاعروں کا وظیفہ پڑھتے تھے غالب کا اور اقبال کا۔ ایک وقت تھا کہ دلی کے گلی کوچوں کی خاک چھان رہے تھے اور ان بوڑھوں اور بوڑھیوں کا کسوچ

رنگتے پھرتے تھے جنہوں نے غالب کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان کی اس تحقیق کی دنیا نے ادب نے بہت داد دی وہ دو مقامات غالبیات میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ مگر علامہ اقبال کے جشن صد سال کے سلسلہ میں انہوں نے جو سرگرمی دکھائی اس کی داد کم ملتی / پیداو زیادہ ملتی۔

پاکستان میں آپ علم و ادب کے بارے میں تھوڑے سے سنجیدہ ہو جائیے، بیداد خود بخود آپ کو ملتی چلی جائے گی۔ وائس چانسلری کے زمانے میں خاں صاحب نے منصوبہ بنایا کہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام غالب کا جشن صد سالہ منایا جائے، اس پر افسران بالائے الگ ناک بھوں چڑھائی اور اہل سیاست الگ ناراض ہوئے۔ جشن کا وقت آنے سے پہلے ہی یونیورسٹی سے وہ سبک دوش کر دیے گئے، مگر اصلی کام انجام پا چکا تھا، یعنی غالب کی ساری نظم و نثر کتابوں کے ایک سلسلہ میں چھپ چکی تھی۔ بس وہ ایک مختصر سا زمانہ تھا جب پاکستان کی تاریخ میں پنجاب یونیورسٹی کو ایک علمی وقار حاصل ہوا اور اس تاریخ سے اس کا رشتہ پیدا ہوا جس کا پاکستان حاصل ہے۔ ورنہ اس یونیورسٹی کو ہم نے پہلے بھی دیکھا تھا اور خاں صاحب کی رخصتی کے بعد سے بھی دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔

تعلیم، تہذیب، ادب، قومی معاملات، یہ معاملات تو ہوئے، مگر ڈاکٹر ذریعہ آغا نے روحانیت میں ان کے شغف کا پتہ دیا۔ مولانا صلاح الدین احمد اور حمید احمد خاں کا اکٹھے ڈاکٹر ذریعہ آغا کے والد کے پاس پہنچنا اور اس صاحب سلوک سے فیض حاصل کر کے واپس ہونا۔ اصل میں باتیں کرنے کے لیے بہت تھیں۔ کچھ باتیں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کیں۔ کچھ باتیں انجم رومانی نے کیں، کچھ باتیں شہرت بخاری نے کیں۔ یہ تو رسمی جلسے کی باتیں ہوئیں مگر غیر رسمی جلسے جو ہو رہے ہیں۔ جہاں چار پرٹھے لکھے آدمی جمع ہوئے اور خاں صاحب کی باتیں ہوئے لگیں۔ کوئی کوئی شخص اس طرح رخصت ہوتا ہے کہ یادوں کا ایک جہان پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

”بدلتا ہے رنگ آسماں“

افسانوی مجموعہ

(زیر طبع)

آغا سہیل

۱۹۴۸ء سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ لیکن اس مجموعہ میں

۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۴ء تک کے افسانوں کا انتخاب شامل ہے

آغا سہیل کے فن کے بارے میں سنجیدہ ادبی حلقوں نے ہمیشہ اچھی رائے دی ہے۔ آپ بھی رجوع فرمائیے۔

مکتبہ اقبال، یک کارنر، گلبرگ ۲، لاہور
سول ایجنٹ۔ مکتبہ کتاب نما فنون۔ ۴۷۔ انارکلی لاہور

پروفیسر اقبال مرزا

حمید احمد خاں کی شخصیت

حضور اکرم سے عشق، اعلیٰ زندگی اور پاکستان سے گہری محبت عبارت ہے

”قاضی، کمالی، باقر ضوی، بھائی احمد خاں میں زندہ ہوں نا؟ آپ مجھے زندہ دیکھ رہے ہیں نا؟ میرے بھائی سلوکی بدخواہ کا قون ملا ہے کہ حمید احمد خاں مر گیا۔“ مقام اسلامیہ کالج سول لائنز میں کالج ہال کے قریب۔ اور سال اگر بھول نہیں رہا ۱۹۶۷ء اور اگر بھول رہا ہوں تو تعجب بھی نہیں۔ کیونکہ حمید احمد خاں کی آواز کے سامنے مہ و سال اور صبح و شام کی کیسا حقیقت تھی۔ ہم میں سے بعض طالب علم اس کمرے میں تھے، خواجیم۔ اسے لائبریری کے برابر ہوٹل کے رُخ ایچ۔ اسے انگریزی کا کمرہ ہوا کرتا تھا۔ رؤف اور بعض دوسرے دوست میرے ساتھ لائبریری کے سامنے والے لان میں تھے کہ ہم نے جانی پہچانی پاٹ دار آواز سنی۔ جس کے استحکام میں کبھی کوئی مشکاف نہ پڑا۔ اور جس کے آہنی آہنگ میں بے مڑے اور شدید زیر و بم کبھی واقع نہ ہوئے۔ بعض احباب ہیں کہ بولتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے جیسے کسی توپ کا دہانہ کھل گیا۔ مگر عین گولہ باری کے دوران، کسی باریک سی شہنائی کی آواز بھی سنائی دے جاتی ہے۔ یا جیسے انجن نے اپنی بھاری جھکم بھکم شروع کی اور گاڑی کے ڈبے سے لکیر کی طرح سیٹی کی آواز آئی۔ جب منہ سے باریک سی آواز آتی ہے تو آواز کا بھرم ٹوٹ جاتا ہے۔ انسان بے مڑا ہو کر خود اپنی نگاہ میں خفیف ہو جاتا ہے۔ جس طرح مولانا علم الدین سالک کی آواز کا بھرم مرتے دم تک قائم رہا۔ اسی طرح پروفیسر حمید احمد خاں کے ہاں صوتی وقار میں کبھی کوئی جھول واقع نہ ہوا۔ اسلامیہ کالج کے ان دونوں جلیل القدر اساتذہ کے میری طرح سیکڑوں شاگرد ہوں گے۔ جن کے ذہنوں کے ٹیپ پر ان کی آواز میں ریکارڈ ہیں۔ ان کے ریکارڈ روم نے ان آوازوں کا تیا پانچ کر کے ان کی انفرادیت جانچی ہوگی۔ قدرت مشکل سے دوسری میں ایک سی بنا تی ہے۔ اسی طرح شہناز و نادریہ ہوتا ہے کہ دو صدائیں ایک سی ہوں۔ اگر ایک سی ہوتیں تو لوگ نقالی نہ کرتے اور یہ میرا دعویٰ ہے کہ حمید احمد خاں کی صوتی نقالی قریب قریب ناممکن تھی۔ اس آواز کی گھمبیرتا کے لیے حمید احمد خاں کے الفاظ چنے کا سلیقہ بھی ہونا چاہیے۔

”حمید احمد خاں مر گیا۔“ کوئی معمولی آواز نہ تھی جس نے سنا دہ پڑے اسٹاف روم کی طرف دوڑا۔ اور ۲۲ مارچ ۱۹۶۷ء کو جس نے سنا دہ بیگم روڈ کی طرف نکل بھاگا۔ میرے پاس حمید احمد خاں کے پکا مسلمان ہونے کے تین ثبوت تھے۔ اُن کی اعلیٰ زندگی علامہ اقبال سے ان کی عقیدت، اور پاکستان کے لیے جذبہ قربانی، اس سال سیرت النبی پرائیڈ

مضمون اور اس کے چند دن بعد جمعہ کے روز سعید اُن کی وفات اور یوم پاکستان پر اُن کی تدفین نے تین اور ٹھوس ثبوت بہم پہنچا دیے۔

۳۳ مارچ کی اس دوپہر یوں ابھرتی تھی اور لاہور خاک ہسرت تھا۔ میں بھری دنیا میں تنہائی کے شدید احساس میں مبتلا تھا حمید احمد خاں میرے لیے ان چند لوگوں میں سے تھے۔ جن سے بہت بے تکلفی نہیں ہو سکتی تھی۔ جن سے ہر وقت ملنے کی ہمت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر جن کے ہونے سے سکون، استحکام، اعتماد اور یقین کی دولت دل کو ملتی تھی، اور یہ احساس بھی کہ زندگی اب بھی وہی ہے جو بیٹن برس پہلے تھی ہم اب بھی وہی ہیں جو بیس برس پہلے تھے۔ میں ان خیالات میں خوش فائدہ کی ایک دوپہر کی طرح شاہراہ قائد اعظم کی ٹیڑھی پر چلا جا رہا تھا کہ میرے تصور میں یونیورسٹی کی جانب سے ایک جلیوں بھرا بڑے باڈار لوگوں کا جلوس جیسے علم اپنے عمامے اور شیلے ٹھامے، لاہور کی سڑکوں پر نکل آیا ہو۔ حمید احمد خاں والس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ہر دوکان پر رک کر ہر بوڑھے اور سوار کو رکارہہ تھے۔ میں نے انھیں والس چانسلر کہا ہے۔ آپ درست کری لیجئے۔ اور شیخ الجامعہ سمجھیے۔ ورنہ میرے اس انگریزی پیوند پر استاد ناراض ہو جائیں گے۔ انھوں نے یونیورسٹی کی صورت بدل دی۔ وہ اسلامیہ کالج سول لائسنز کا ناک نقشہ درست کر کے آئے تھے۔ ان کا شاہجہانی عمل یہاں بھی شروع ہو گیا۔ شعبوں کے نام اردو ہو گئے، ادارہ فلیکیات سے لے کر شعبہ تاریخ ادب انگریزی اور علوم عمرانیات اور تحقیق و تدریس کے تمام شعبے اردو میں نہا گئے۔ ان کے زمانے میں صدائے کُن فیکون دمام آتی رہی اور گیسوئے اردو اُن کے شانے سے سنورتے رہے۔ ان کے بس میں نہیں تھا۔ ورنہ یونیورسٹی جسے انھوں نے جامعہ بنادیا، سرتاسر بدل کر رہ جاتی۔ انھیں اختیار حاصل ہوتا تو وہ لڑکوں کو پھاڑے دے کر اپنے ہاتھ میں کڈال تھا کہ کچھ لڑکے بٹ کدے مسمار کر دیتے۔ شاید انھیں اپنی مجبوریوں کا شدید احساس ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ والس چانسلر حمید احمد خاں، پرنسپل حمید احمد خاں سے عمر میں بیس سال بڑے لگتے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں کسی طرح ۳۵ سال سے زیادہ کے نظر نہیں آتے تھے۔ لیکن سڑکی نے فلائٹس ٹائٹ انگیل کے سوانحی مضمون میں لکھا ہے کہ ”وہ اپنی دھن کی اتنی پکڑ تھی اور کام میں اتنی مکن، کہ خدا کی حیثیت بھی اس کے نزدیک رنغور بالند، ایک انجینئر کی سی تھی اور اس کا بس چلتا تو اسے بھی وہ اپنے ساتھ کام میں جوت دیتی۔“ حمید احمد خاں مسلمان تھے اور محنت ان کا ایمان تھا۔ کام کا جہاں تک تعلق ہے وہ مولوی عبدالحق کے نام دیو۔ مانی سے کم نہ تھے۔ جو پھولوں کی کیا ریاں اپنے خون سے سینچتا تھا اور جب پھول کھلتے تو خود کھل اٹھتا۔ ایسے ہزار ہا پھول اس دنام دیو، نے دونوں اسلامیہ کالجوں، یونیورسٹی، ادارہ ثقافت اسلامیہ اور مجلس ترقی ادب میں کھلائے مگر جہاں پھول ہوتے ہیں۔ کانٹے بھی اُگتے ہیں۔ حمید احمد خاں گلستاں میں زہریلی بوٹیاں اور توکیلے کانٹے دیکھتے تو کدال لے کر خود اکھاڑنے لگتے۔ ان کے ہاں قینچی سے تراشنے کا عمل بھی تھا۔ لیکن زمانہ زہریلی جڑی بوٹیوں کا تھا اور گلستان تیزی سے جنگل بنتے جا رہے تھے۔ بیچارے حمید احمد خاں اکیلے رہ گئے وہ کیا رلیوں، چمنوں اور گل دستوں کے مالی تھے، جنگل کے نہیں تھے۔ مگر وہ اپنی دھن میں ہوا کے سامنے چراغ لے کے چلے۔

سال اول ۱۹۶۵ء میں ہی ان کے چلن رکھ رکھاؤ اور ان کی ممتاز شخصیت کا سکہ دل پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر ۱۹۶۸ء میں جب اپنے جگر تخت تخت کو جمع کر کے تعلیم کے تیسرے سال میں قدم رکھا اور ایک مہاجر کمپنم نامہ کان سے بے سروسامانی کے ساتھ کلاس میں جا بیٹھا تو جانی پہچانی آواز ڈالس سے گونجی۔ غالب نے ۱۹۷۸ء کی تباہی کو قیامت

اور اس کے اختتام کو اپنے دوسرے جنم سے تعبیر کیا ہے۔ اس نئی زندگی میں انھیں کچھلے جنم کی آوازیں سنائی دینے لگیں تو زندگی پر ان کا اعتماد بحال ہونے لگا تھا۔ کچھ ہی کیفیت میرے دل میں حمید احمد خاں کی آواز نے برپا کر دی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ اسی اپنے انداز میں نبی ملی انگریزی میں کہ ملکہ انزہ تھنے فیری کو یکن کا کیا صلہ دیا؟ آئرلینڈ کی گورنری؟ یہ عطا کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو مشرقی پنجاب سے لٹ لٹا کر آئے ہیں انھیں اگر حکومت پاکستان اضلاع انبالہ کی یا امرتسر کی ملکیت کے تمسکات دے دے تو ان کے دل پر کیا بیتے گی؟ سو ایسا مذاق بے چارے شاعر سپر سے ہوا۔ ادبی نکتے فلسفیانہ رموز اور ثقافتی مسائل کو ذہن نشین کرانے میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ الفاظ کے پرے کے پرے ان کے حضور دست بستہ کھڑے رہتے تھے اور وہ بڑی صفائی سے جس کو رکنا نڈر وار کیے بغیر خالی پلٹ گیا ہو۔ وہ دست بدست جنگ کے قائل تھے۔ الفاظ کے ہر سپاہی کے قدر شناس تھے۔ اسی لیے انارڈی میرلشکر نہ تھے کہ ان کی کھیپ کٹوا دیتے۔ ہر لفظ ایک بہادر جاں باز کی طرح اُجلی جلی وردی میں سامنے آتا اور للکارتا۔ وہ مبارزہ طلبی کے قائل تھے۔ بھیڑ بھاڑ کے قائل نہ تھے۔ الفاظ کے ان کے لشکر میں گورے اور کالے دونوں قسم کے سپاہی تھے۔ مگر گوروں کالوں کو انھوں نے کبھی حلقہ ملا نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ انگریزی میں وہ اسی رکھ رکھاؤ سچوچ بچار اور اہتمام سے کام لیتے جیسے اردو بولتے وقت انھوں نے کبھی غالب کو محض غالب ذوق کو صرف ذوق اور حالی کو حالی نہیں کہا، بلکہ اسد اللہ خاں، محمد ابراہیم اور الطاف حسین کے نام یوں ادا کرتے جیسے غالب، ذوق اور حالی تھے چلے آ رہے ہیں۔ اہتمام ایسا لفظ ہے جس میں ان کی شخصیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جن لوگوں نے انھیں انگریزی لفظ 'ALTHOUGH' بولتے سنا ہے۔ وہ ان کے تلفظ ادائیگی زور اور ٹھہراؤ کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو جیٹ بلکہ راکٹ کی رفتار سے بولتے چلے جاتے ہیں۔ گویا محو میں الفاظ کے دریا بہا دیتے ہیں۔ شبنم کی طرح انھیں بہنا نہیں آتا مگر ان کے مجموعی تاثر پر حمید احمد خاں کی زبان سے ادا ہونے والے دو لفظ حاوی ہو جاتے تھے۔

حمید احمد خاں کو ملٹن کی طرح اپنی تصنیفی صلاحیت پر بہت مشکل سے اعتبار آیا ہوگا۔ ملٹن کے سرثیلی ٹی ہیں LYCIDAS پر مزے لے کر تبصرہ فرمایا کرتے تھے کہ کیمبرج ڈکرائسٹ کالج کے زمانہ طالب علمی میں اس کے کالج کا ایک ہونہار طالب علم ایڈورڈ کنگ بحری سفر میں ڈوب مرا۔ ملٹن کی مشق سخن کا زمانہ تھا۔ دوستوں نے کنگ کا مٹھ لکھنے پر مجبور کیا۔ بادل نا خواستہ قلم اٹھایا اور یوں ابتدا کی کہ ابھی شجر سخن میں میوہ ناپختہ اور نارس ہے اور مجھے اس کچے پھل کو توڑنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ ذرا تحقیق کی جائے تو یہ جاننا مشکل نہیں ہوگا کہ استاد نے کسی مجبوری کے تحت لکھنا شروع کیا۔ اور ابتدائی کاوش کے کیا ثمرات تھے؟ بہر حال ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ وہ ہر لیکچر اس اہتمام سے دیتے تھے، جیسے ان کی زندگی کا یہی واحد لیکچر ہے۔ مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ حمید احمد خاں لیکچر کا باقاعدہ پلان بناتے تھے۔ کیونکہ ایک بار بوطبقا پڑھاتے ہوئے انھوں نے بے اختیاری میں اس کا پلان تختہ سیاہ پر لکھ ڈالا۔ پلان کے تحت قدم اٹھانا اور اس خوبصورتی سے کہ فطری اور بلا تکلف معلوم ہو۔ استاد کا معمول زندگی بن گیا تھا۔ ان کے مسودات پڑا اگر محفوظ ہوں، نظر ڈالی جائے تو مجھے یقین ہے کہ رد و بدل کی پینسل نے کئی کئی رنگ بدلے

ہوں گے۔ ان کی احتیاط اور ان کا اہتمام ان کی گفتار و تحریر کے علاوہ ان کے لباس، ان کی رفتار میں بھی صاف جھلکتا تھا۔ اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) میں انھیں پرانی مگر ستھری سائیکل سے اترتے دیکھا ہے۔ جھنگ کے بنے ہوئے بھوڑے ٹوڈ کے موٹے چمک کوٹ میں ملبوس تھے (بلکہ ہوا کرتے تھے) اس پر گہری براؤن ٹائی بنگے سے سفید کالر میں بہت پھبتی تھی۔ پھر اس کی رنگ کی وورسٹڈ پیٹ۔ اس سسٹے کی ٹیشن میں بھی حمید احمد خاں کا ذوق جمال اپنی رعنائی میں لیتا تھا۔ اتنا ترک کی طرح پشت سر کی طرف بچے ہوئے بال جن سے پیشانی بہت کشادہ نظر آتی۔ باریک بھوؤں کے نیچے روشن آنکھیں، سنوواں ناک، ہونٹ تیلے اور قل شیو چہرہ جو نہ بالکل کتا بنی نہ گول، قدمیا نہ کہا جاسکتا، اگر جسم پر ڈاکٹر تاثیر کی فرہمی ہوتی تو قد چھوٹا کہلاتا۔ اسلامیہ کالج سول لائنز کے پرنسپل آکسفورڈ مینی مورس کی سبز گاڑی سے قیمتی سوٹ میں اترتے تو بھی وہی سن پتیا لیس کے حمید احمد خاں معلوم ہوتے، کیونکہ اُس اور اس حمید احمد خاں میں نفاست پسندی، شرافت اور علمی وجاہت مشترک تھی۔ شیطان کی تبیر مختلف طبائع مختلف انداز سے کرتی ہیں بعض لوگ اسے حسد، بغض اور غصے کا دیوتا کہتے ہیں اور بعض اسے تلبیس و فریب کی صورت سے جانتے ہیں۔ حمید احمد خاں کے نزدیک اس کا سب سے کریہہ منظر سطحیت، بازاری اور سستے پن میں تھا۔ یہ سطحیت خواہ رپورٹروں میں ہوتی یا رہنماؤں میں، علماء میں ہوتی یا اساتذہ میں، ان کی نفرت کی مستحق ٹھہرتی تھی۔ انسان جی جمال بندی کے اس نقشے میں بدذوقی، سطحیت اور سستے پن کی مخفی نکیں غائب تھیں۔ شخصیت کوئی بھی ہوتی، استاد اس کی مکمل تصویر کے عکس کے لیے کوئی نہ کوئی مرکزی لفظ ضرور ذہن میں رکھتے تھے۔ مثلاً خانی کے لیے شرافت، غالب کے لیے وجاہت، ملٹن کے لیے CHASTITY یعنی پاکیزگی، اپنے لیے بھی ان کے ذہن میں محتاط، جیسا کوئی لفظ ضرور ہوگا۔ غالباً اسی لفظ کے توسط سے ہم ان کی شخصیت کا تصور قائم کر سکتے ہیں۔

معصوم ذہن سیاسی رہنماؤں اور ہزرگوں خصوصاً اساتذہ کے ایچ قائم کر لیتے ہیں۔ پھر ایچ کی شکست و ریخت شروع ہو جاتی ہے۔ حمید احمد خاں کی شخصیت کا جو پر تو میرے ذہن میں اس وقت قائم ہوا تھا۔ جب میں سال اول کا طالب علم تھا۔ اس سے کہیں زیادہ شان و شکوہ کے ساتھ اب بھی اپنی اپنی ابتدائی بنیادوں پر قائم ہے۔ میری زندگی کا بہر حال یہاں چنبھا ہے کہ حمید احمد خاں کو میں نے انگریزی میں ملٹن کے روپ میں دیکھا اور میں اب تک یعنی ۲۵ سال بعد اسی نظریے پر مصر ہوں۔ اردو میں میں نے انھیں غالب کے روپ میں دیکھا اور اس ایچ میں بھی کسی تبدیلی کا روادار نہیں، ملٹن پر ان کی تصنیف درنہ حمید بیگم اس قائم کردہ ایچ سے بہت بعد کی چیزیں ہیں۔ میرے اسل ایچ کی تشکیل میں ان تصانیف کو کوئی دخل نہیں۔ مجھے تو ان کے اہتمام رکھ رکھاؤ، ثقافت پسندی اور عقیدے کی پختلی سے خیال ہوا تھا کہ انگریزی ادب میں اگر کسی کے قریب ہیں تو ملٹن کے ہیں۔ ارسطو اور ملٹن جس اہتمام سے انھوں نے ہمیں پڑھائے۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ ان کی تحریر کی طرح ان کی شخصیت سے بھی متاثر ہیں۔ شیکسپیر یقیناً انگریزی ادب میں بہت بلند مقام پر فائز ہے لیکن ملٹن کی طرح اسے احساس ذات نہیں ہے۔ ملٹن جس طرح نظام کائنات میں بزدائی اور برہمنی قوتوں سے برسرِ پیکار نظر آتا ہے کچھ وہی کیفیت حمید احمد خاں کی ذات میں نظر آتی تھی۔ خیر و شر کی آویزش ہوتی یا کسی نظریے کے تحفظ کا سوال۔ وہ نکلے تو اندھی قوتوں سے لڑنے کی سکت لے کر برف نکلے تھے۔ یہی ارتقاء مقام اور اہتمام تشخص غالب کے ہاں بھی ہے۔ جس کی انا کے سامنے دنیا باز بچہ اطفال ہے۔

اورنگ سیمان اک کھیل اور اعجاز میما محض اک بات ہے۔

وہ زود جس ضرورت تھے مگر زود رخ نہیں تھے۔ وہ نہ جلدی گھل مل جانے والے تھے اور نہ مل کر بھول جانے والے تھے۔ ان کے احساسات نازک تھے اور اپنے قلوب کیے ہوئے معیار حیات کو گرد و پیش میں جاری دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اکثر چوٹ کھاتے تھے۔ وہ جذباتی ہو جاتے مگر جذبات میں کیے ہوئے فیصلوں کو خود ہی مسترد کر دیتے۔ ششما کی سربوٹ کا زمانہ تھا۔ پرنسپل حمید احمد خاں کا حکم جاری ہو چکا تھا کہ طلبہ یونیفارم میں آیا کریں۔ سبز کوٹ یا بھورے رنگ کی جرسی میں۔ فن کار کی جس نقل اور حسن تخلیق پر آفتابی کرنیں پڑ رہی تھیں کہ اچانک ان کی نظروں کی تارچ کا رخ ہوٹل کی جانب ہو گیا۔ وہاں سے نگرہ زن ایک طالب علم شلووار اور قمیص میں نکلا۔ حمید احمد خاں اخلاطونی نظریہ شاعری کو میز پر بیچ لکھنے سے کود گئے۔ اور اس لڑکے کی طرف لپکے، وہ اسے قدموں بچھا گا۔ ادھر سے کوئی صاحب آرہے تھے۔ انھوں نے لڑکے کو پکڑ لیا۔ حمید احمد خاں کے چانٹنے کی آواز ہم نے سنی، کلاس ختم ہو گئی۔ روکا پرنسپل کے سامنے حاضر، پوچھا گیا یونیفارم کیوں نہیں پہنی؟ بیٹی کا کوئی معاملہ؟ بیچ میں آیا تھا۔ یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ مگر حمید احمد خاں کو روتے سب نے دیکھا، فوراً قاضی صاحب دھڑلہ کرکے کی طلبی ہوئی۔ حکم ہوا کہ سوٹ کے پیسے فوراً کسی نہ کسی مدرسے ادا کیے جائیں۔ حمید احمد خاں اس رنگ کے شگفتہ پھول تھے۔ جن کی تروتازگی کے لیے آبیاری لازمی تھی مگر ارد گرد کی زمین شور ہوئی جارہی تھی۔

ان کا سفر ملازمت اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے شروع ہو کر شاہراہ قائد اعظم کے سول لائنز اور یونیورسٹی والے سرے سے اچکی سن کالج والے سرے پر مجلس ترقی ادب کی نرسنگھ داس بلڈنگ میں ختم ہوا۔ وہ استاد سے والٹس چانسٹر کچھ ڈائریکٹر اکل ملک میں معزز اور کچھ مختلف وفود کے محترم سربراہ ہوئے۔ لیکن حمید احمد خاں لیکچرار کے پاس میگیم روڈ پر جو مکان تھا وہ وہیں رہا۔ بیس تیس سال کے عرصے میں کوڑی، کوڑی والے لکھ پتی اور کوڑی کے ڈھیر سونا لگنے کی مشینیں بن گئیں۔ مگر حمید احمد خاں محنت کا سرمایہ دہی نام دیونا ہی رہا۔ لوگوں کو عموماً دو طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کام کرنے والے اور دوسرے بیکار اور نکٹھو، انکے کام کرنے والی برادری میں بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک کام چور اور دوسرے 'نام دیو'، مالی کام چوروں کے نام نہاد حقوق دلائے کے لیے انجمنوں کی کمی نہیں۔ مگر دنیا میں ایسے نام دیو بھی ہیں جو نام کے ہی نہیں کام کے بھی دیو ہیں۔ چپ چاپ کام کیے جاتے ہیں۔ انھیں اپنی کیاریوں سے اس لیے عشق ہے کہ پھول کھلیں گے۔ جن میں بہا ر آئے گی۔ یہی ان کا صلہ ہوگا۔ وہ اپنی لگن، اپنے فن میں معاوضے کے اتار چڑھاؤ سے کمی بیشی نہیں کر سکتے۔ ان کی محنت کے لیے نہ پیش کی گارنٹی ہے۔ نہ گریجوٹی کی۔ ان کی محنت کا صلہ یہی ہے کہ ان کے بار محنت میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ حمید احمد خاں اپنے بوڑھے ہوتے جسم پر بار کا اضافہ کرتے ہی چلے گئے۔ میں نے انھیں والٹس چانسٹر کے کمرے میں فائلوں کے ڈھیر کے پیچھے بیٹھے دیکھا اور ان کے دو قیمتی منٹ ضائع کر کے عمر بھر کی ندامت اپنے سر لے آیا۔ ہوا یہ کہ میں نے لاہور کے ایک کالج میں اپنی موجودگی کا احراز اس دلائے کے لیے انھیں ایک خط لکھ ڈالا جس میں خواہش ظاہر کی کہ انگریزی ادب میں ریسرچ کے لیے کام چاہتا ہوں۔ وہ چاہتے تو ان کا سیکریٹری وقت ملاقات کی اطلاع دو دفعوں میں مجھے دے دیتا۔ مگر انھوں نے میرے دو صفحے کے خط کا چار صفحے میں جواب دیا اور ملاقات کا وقت دیا۔ جب انھوں نے فرمایا کہ پنجاب یونیورسٹی میں انگریزی پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے سیر دست کوئی انتظام نہیں تو آپ میری خفت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ احساس جرم کیا کم تھا کہ اتنی سیدھی بات جو انکو اتنی سے معلوم ہو سکتی تھی ان کے دو منٹ ضائع

کر گئی۔ ایسے ہی چھوٹے چھوٹے معاملات یونیورسٹی کے عزیز طلبہ ان کے درپردہ کر آتے تھے جس شخص نے اپنی عمر کے آخری پچیس سال میں تیزی سے وہ فاصلے قطع کیے تھے جو عموماً پچاس سال میں طے ہوتے جس نے وقت کے ایک ایک لمحے پر سخت گرفت رکھی اس کے بیسیوں گھنٹوں کو لوگوں نے بے وردی سے کچلا۔ پینتالیس برس تک کام کرنے کی ان کی جو رفتار رہی ہوگی آخری ۲۵ سال میں کم از کم دس گنا تو ضرور بڑھ گئی ہوگی۔ پچاس برس کی عمر میں ایم۔ اے۔ کیمریج سے پھر ایک بے قابو بے ہنگم بڑے سے ادارے کی پرنسپل، پھر اس سے بھی زیادہ بے ترتیب دیکھ خورہ اور منزلوں ادارے کی سربراہی پھر انتظامی امور کے بعد تصنیف و تالیف مجلس ترقی ادب، شام ہمدرد میں تقاریر، بیرونی ممالک میں نمائندگی۔ ان سب ذمہ داریوں میں عمر کی ترقی کی نسبت سے دس گنا اضافہ ہوتا چلا گیا۔ قضا و قدر کے فرشتے عمر کے اس حصے میں حکم دیتے ہیں۔ آہستہ خرام بلکہ محرم جس میں آرام و سکون کا جوگ اور سنیاں ضروری ہوجا رہے۔ اس عمر میں بغیر لونین کا یہ مزدور محنت کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ سمندر میں اس غروب آفتاب کا نظارہ میں نے مکمل غروب سے دس دن پہلے کیا تھا۔ ہوا یوں کہ اچانک بیٹھے بیٹھے دل میں خیال آیا کہ دراموں کا مجموعہ جیسے تو اس کے ساتھ استاد کا تعارف شامل ہو جائے۔ میری تصنیفی زندگی کے یہ خیال بہت بڑا سرمایہ حیات تھا پورچ سے برآمدے میں اور برآمدے سے اس چوکور وسیع کمرے میں داخل ہوا جو نرسنگہ داس کوٹھی کے دوسرے کمرے میں گھرا ہوا ہے۔ آئے تشریف رکھے۔ کہیے کیسے آنا ہوا قہقہہ ہنسی سے فلاں دوست نے دراموں کا ایک نسخہ ترتیب دے کر پیش لفظ کے لیے بھیجا تھا چھ ماہ سے اوپر ہو چکے ہیں میری دراز میں بٹلے۔ علامہ اقبال پر مضمون لکھ رہا ہوں اس یوم اقبال پر پڑھوں گا۔ لیکن کام کی زیادتی اتنی ہے کہ بمشکل ایک آدھ صفحہ لکھ پاتا ہوں جیسٹس ایس۔ اے۔ رحمان میرے بچپن کے دوست ہیں۔ یعنی قلم و دوات اور سختی کے زمانے سے، ان کے لیے پیش لفظ لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر کئی جینے ہو چکے ہیں کچھ نہیں لکھ سکا جب بھی تقاضے کا فون آتا ہے ٹیر منڈہ ہوتا ہوں (فون) سہلو آفاہ یحییٰ آپ کی بڑی طویل عمر ہے بھائی! اتفاق دیکھو جسٹس رحمان کا فون ہے ابھی ابھی ایک عزیز شاگرد سے آپ کا تذکرہ کر رہا تھا۔ جی ہاں وہی آپ کے کلام کے سلسلے میں پیش لفظ کی بات ہو رہی تھی۔ اطمینان رہے میں جلد ہی وقت نکالوں گا۔ اچھا خدا حافظ۔ ہاں تو اقبال صاحب مجموعہ پریس میں کب تک بھیجے کارا دہے۔ دیکھو کھٹی اب میری صحت قابل اطمینان نہیں رہی۔ میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ کم از کم اس سال تو نہیں اچھا اکتوبر نومبر میں مسودہ تیار ہوگا۔ پھر ٹھیک ہے زندہ رہا تو دسمبر یا جنوری ۱۹۷۷ء میں ملنا، میں پیش لفظ لکھوں گا۔ اسے کبھی کون لکھتا ہے کتنے دن اور جینا ہے۔ یہ آخری جملہ میرے اس جملے کے بعد ادا ہوا تھا کہ میں غالب تو نہیں، آپ کے لیے ہزار برس جینے کی دعا مانگوں، ہاں دلی جذبات یہ کہتے ہیں کہ جب تک ہم زندہ ہیں آپ اسی طرح کام کرتے نظر آتے رہیں۔

انھی خیالات میں مگن گھومتے گھماتے شاہی مسجد جا پہنچا تھا اس کے پچیلے بوئے دائیں بائیں دونوں بازوؤں میں طلبہ کے کمرے خالی تھے (تقریباً دو سو برس سے) اور کرائسٹ چرچ ٹریٹی کالج (کیمریج) کے پچیلے بوئے بازوؤں کے حجرے میں سیکولر طلبہ کی دنیا سمیٹ ہوئی تھی۔ تقریباً ہزار برس سے مذہب کے خلاف شور مچانے والے مذہب کے دامن کو نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ حمید احمد خاں کے مشاہد اور استنباط تھے، لوٹتے ہوئے مزار اقبال پر استاد کی مغزرت کی دعا کی۔ قلعے کی جنوبی دیوار سے ہوتا ہوا مٹی گیسٹ، مسجد، سکیم شاہی پھر سید مٹھا، لوہاری انارکلی، غرض ان کے خیال کے ساتھ جگہ جگہ ادارہ پھر۔ لاہور میں کوئی تبدیلی نہیں تھی وہ مغلوں کی عظیمستوں، انگریزوں کی عنایتوں کو زیر دامن یہ پہاڑ کی اٹل استقامت کی طرح کھڑا تھا اس کے دامن کی خاک کتنی تابناک ہو گئی ہے کہاں کہاں سے کیسے کیسے لوگ یہاں کھنچے چلے آئے شہنشاہ جہانگیر، مغل شہزادے شہزادیاں، غیاث بیگ کی بیٹی، برصغیر کی ملکہ، لکھنؤ کا درنا، یاب اور اب کرم آباد کا گوہر آب درمیل سرشتی کو "لیٹم" نہیں کہہ سکتا، نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس مٹی کو پاؤں پکڑنا نہیں آتا یہ تو بھرے خزانے اپنی طرف مائل کرتی ہے اور آغوش میں سلا دیتی ہے۔

ابن انشا

یادیار مہربان

لدھیانے سے ہم نے میٹرک پاس کیا تو آگے کی فکر ہوئی۔ ممبر ہمارے اچھے تھے بلکہ یونیورسٹی میں پوزیشن بھی تھی کہیں بھی داخل ہو سکتے تھے۔ خود لدھیانے میں اچھا خاصا گورنمنٹ کالج موجود تھا۔ اور ہمارے اپنے ضلع کے صدر مقام جالندھر میں کئی کالج تھے۔ لیکن مرحوم حمید نظامی نے جن سے ہماری دوستانہ خط و کتابت تھی تجویز کیا کہ لاہور آؤ۔ اسلامیہ کالج میں پڑھو۔ لاہور کا اسلامیہ کالج پنجاب کا علی گڑھ تھا اور اپنڈرہ روزہ یا پھر ہفت روزہ (نوائے وقت کے روزاقول سے قاری ہونے کے باعث قوم اور اسلام بلکہ اسلام سے زیادہ مسلم لیگ کا درد دل میں بہت تھا۔) پس ہم نے کہا۔ اٹھاؤ ڈھول اور تاشے اور چلو لاہور۔

اور یوں اسلامیہ کالج میں داخلے کی تقریب سے ہماری دفتر حمید احمد خاں کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ یہ پہلی حاضری تھی۔ آخری حاضری کچھ سال لاہور میں ہوئی جب نہ جانے کس میٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد ہم اپنی اُدھار مانگی ہوئی گاڑی میں ان کو ان کے سرسبز فضا مکان میں چھوڑنے گئے۔ کالج میں داخلے سے پروفیسر صاحب کا کوئی راست تعلق نہ تھا۔ لیکن ہمارے ہاں تعارفی رقعہ حمید نظامی مرحوم کا تھا، اوردہ نظامی صاحب کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے۔ اخلاق سے تو وہ سب سے ملتے تھے، ہم پر بھی شفقت ہوئی۔ فارم دفتر سے منگایا، اپنے سامنے بھروایا۔ اس میں ہم نے اپنا اصلی نام شہ محمد خاں لکھا تو محمد کے بجائے M O H D لکھ گئے۔ اسکول میں بھی بیشتر ایسے ہی لکھتے تھے۔ پروفیسر صاحب نے ہمیں لو کا اور کہا یہ ہمارے رسول اکرم کا نام ہے۔ اسے کبھی مختصر نہ لکھنا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ ہم نے ہمیشہ اس مبارک نام کو پورا ہی لکھا۔

پروفیسر صاحب سے ہم نے نہیں پڑھا۔ وہ بی۔ اے کو پڑھاتے تھے۔ ہمیں پروفیسر سید فیاض محمود پڑھاتے تھے اور کیا خوب پڑھاتے تھے۔ البتہ ہم ٹیوٹوریل گروپ میں پروفیسر حمید احمد خاں کے تھے۔ نام تو ہمارا پروفیسر ایس۔ ایم۔ اختر کے گروپ میں تھا، لیکن ہم نے بدلو کر حمید احمد خاں صاحب کے گروپ میں کرایا۔ انیسوس کے عشرے روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

اس کالج میں ہمارا دانہ پانی زیادہ دن نہ رہا۔ سال بھر بعد ہم نے وہاں سے چھٹی کی اور پروفیسر صاحب

سے دوبارہ ربط ضبط قیام پاکستان کے بعد شروع ہوا۔ بلکہ ان پچھلے چھ سات سال میں مرکزی اردو بورڈ کی نسبت سے۔ ہم اس کے ممبر تھے۔ وہ پہلے ممبر پھر چیئرمین ہوئے۔ پرائی روایات اور وضع داری کے تحت ہم نے ان کو استادی جانا اور کہا، اور انھوں نے ازراہ ملاطفت قبول کیا۔ یونیورسٹی کی وائس چانسلری اور مجلس ترقی ادب کی ڈائریکٹری کے زمانے میں بھی ان سے نیاز حاصل ہوتے رہے۔ اور کتابوں کی نمایاں اور دوسرے انتظامات کے سلسلے میں بھی جب کبھی ہمیں ان سے سرکاری یا غیر سرکاری کام پڑا، وہ اپنی استاذانہ توجہ سے ہمیں نوازتے رہے۔

اگر ہم شاگرد تھے تو ان کے چوالیس نہرا پانچ سواٹھانے شاگردوں میں سے ایک تھے۔ ہمارے لیے یہ وجہ مبہات سہی، ان کے لیے کچھ بات نہ تھی، اتنے شاگردوں کے نام بھی کوئی یاد نہیں رکھ سکتا۔ ان کے نام اور مقام، ان کے علم و فضل سے ہم ان سے متعارف ہونے سے پہلے سے واقف تھے اور متعارف ہونے کے بعد بھی یہی رشتہ جانا چاہیے، جو مضمون ہمارے دل پر نقش ہے، وہ جہازی سائز کے ادبی دنیا میں شہزادہ خضر سلطان سے ان کی دلی میں ملاقات والا مضمون ہے۔ ہمایوں کے پرانے خاندانوں میں ان کے مضامین بہت دیکھے، بلکہ ہمایوں کے دورِ اول میں جو ۱۹۲۵ء کے آس پاس تھا، ان کے فاضلانہ مضامین دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کیونکہ اس زمانے میں یہ بین، بائیں برس کے رہے ہوں گے۔ حالیہ زمانے میں ان کے غالب پر کام نے اشتہار پایا۔ شروع کے رشتے آخر تک چلتے ہیں۔ اس لیے پروفیسر صاحب سے ہم اس طرح تو کبھی بے تکلف نہ ہو سکے، جس طرح ان کے برادر بزرگ حامد علی خاں مدیر ہمایوں، والحقاً سے رہے اور ہیں۔ تاہم یہی فخر ہمارے لیے بہت ہے کہ جو فیضان ان کی شخصیت اور علم سے ہم حاصل کر سکتے تھے، اس سے محروم نہیں رہے۔

شیشے کی آبرو

جواں سال افسانہ نگار

قمر عباس ندیم

کے منتخب اور بہترین افسانوں کا

نمایندہ مجموعہ

عنقریب شایع ہو رہا ہے

مرزا ظفر احسن

ہم ذوق، ہمدرد، ہم داستان

پروفیسر حمید احمد خاں سے میرا جو رشتہ بلکہ کئی ناتے تھے مرحوم ہی کے الفاظ میں سنئے۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو جو میرے نام موصوف کا آخری خط تھا تحریر فرمایا:

برادر عزیز! بقدر

..... میری کوتاہی فکر ملاحظہ کیجیے کہ اب تک میں نے آپ کو صرف غالب شناس طبقے کے لیے ایک مرکز سی و عمل قرار دے رکھا تھا۔ لیکن آپ کی پُر لطف کتاب ذکرِ یار چلے ہاتھ آئی تو اندازہ ہوا کہ غالب کی عظیم الشان برادری سے قطع نظر، حیدر آباد اور عثمانیہ یونیورسٹی کے رشتے سے ہم دونوں ایک ہی ہم ذوق ہم درد اور ہم داستان کہنے میں شامل ہیں۔ یہ تصویروں بھی دل کو گرمادینے والا تھا مگر آپ کی کتاب سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ میرے لیے اس کتاب نے گویا گردشِ ایام کا رخ پلٹ دیا اور یوں معلوم ہوا کہ میں عابد شاپ اور انگریزی سے پیٹے خانے سے گزرتا ہوا پھر توپے کے سانچے کی طرف رواں دواں ہوں۔ اور آغا منزل بیات منزل وغیرہ سلسلہ عمارات میں ایک بار پھر ولنکر صاحب اور حسین عالی خاں صاحب (اور خدا جانے اور کس کس استاد) کے لیکچروں میں شامل ہونے کے لیے سراپا اشتیاق ہوں عثمانیہ یونیورسٹی کو تیس برس کی زندگی نصیب ہوئی۔ لیکن کیسے تیس برس کہ مسلمانانِ بر عظیم کی تاریخ میں ایک نیا باب کھل گیا۔ آپ کے قلم کو خدا نے یہ طاقت دی کہ جو کل کی بات تھی وہ آج کی بات اور ہمیشہ کی بات بن گئی۔ مرجا

اے حیدر آباد دکن کا بارونق بازار۔

اے حیدر آباد میں ڈاک خانے کو ٹپہ خانہ کہتے تھے۔ آزادی سے پہلے عابد شاپ پر امپریل پوسٹ آفس تھا جسے انگریزی ٹپہ خانہ کہتے تھے۔ ریاست حیدر آباد کے باہر جانے والی ڈاک کا تعلق اسی ڈاک خانے سے تھا۔ ۳۱ ایک محلے کا نام

جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پانا میں اپنے لیے باعث شرف سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ اعزاز در اعزاز بھی نصیب ہوا جس لیاقت منزل اور آغا منزل میں حمید احمد خاں نے علم حاصل کیا اور جن پروفیسر حسین علی خاں سے موصوفہ انگریزی کے درس لیے وہیں اور ان ہی سے میں نے بھی تھوڑا بہت سیکھا ہے۔ آج سے چند سال پہلے انجمن طلبہ قدیم جامعہ عثمانیہ کراچی نے جامعہ کا جشن طلافی منایا تو اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود حمید احمد خاں صدر کرنے کے لیے بطور خاص لاہور سے آئے۔ بڑے ولولے اور جوش کے ساتھ دکن کے اپنے آخری سفر کے حالات طالع علمی کے واقعات اور پرانے شہنشاہ اساتذہ کی خدمت میں حاضری دینے کے قصے سنائے۔ حسین علی خاں صاحب کا اس وقت تک انتقال ہو چکا تھا، مگر آپ ان کے گھر گئے اہل خانہ کو رپسہ دیا۔ ان کا کتب خانہ بڑے شہر سے دیکھا اور وہاں اپنے استاد کی یادیں مجتمع کرتے ہوئے کچھ وقت گزارا۔ دوسرے استادوں اور پرانے ہندو مسلم دوستوں سے بھی ملے۔ اردو سے والہانہ محبت ان کا ایمان اور جامعہ عثمانیہ کو اردو کا عظیم ادارہ تسلیم کرنا اس ایسا لازمی جزو تھا۔ جس محفل میں جامعہ کی بات چلی حمید احمد خاں کی زبان سے کلمات توصیف ہی نکلے۔ وہ اپنی مادر علم کے بچے سپوت تھے۔

غائب لاہور پیری کے شعبے ”ادیبوں کے خطوط“ میں فی الوقت مرحوم کے صرف دس خطوط محفوظ ہیں۔ اصحاب کے نام حمید احمد خاں صاحب خطوط لکھتے رہے ہیں۔ ان سے درخواست ہے کہ مرحوم کے تمام خطوط غالب لاہور پیری کو عطا کریں تاکہ وہ محفوظ ہو جائیں اور آئندہ کے محققین کو تحقیقی کام کرنے میں سہولت بھی ہو۔ ایک خط (مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۵۹ء) سید سبط حسن کے نام ہے اور ان ہی سے غالب لاہور پیری کو ملا بھی ہے۔ اس میں مرحوم کے مقالے (پاکستان کا نظام تعلیم) کی لیل و نہار کے سال نامے میں اشاعت کا ذکر ہے۔ دوسرا خط (مورخہ ۱۲/۱۹۶۱ء) قہارپ داغ کے مقدمے لڑتے سید سبط حسن کی بابت ہے۔ یہ خط بھی سبط حسن ہی کا عطیہ ہے۔ ان کی امتیازی خصوصیت مرحوم کا وہ بے لاگ تبصرہ ہے جو انھوں نے سبط حسن کے اُس وقت کے طبع شدنی مقبہ پر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ”اپنے اصل موضوع سے کسی قدر بے تعلق ہے“ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ ”یہ غیر متناسب معلوم ہوتی ہے اور قارئین کو یقیناً کھٹے گی۔“ ایک اور جگہ اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔ ”موجود صورت میں یہ مقالہ اہمیت خوب ہونے کے باوجود کسی اور موضوع پر لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے“۔

میں نے یہ دو تین مثالیں محض یہ بتانے کی خاطر نقل کی ہیں کہ حمید احمد خاں علم اور صاحب علم دونوں معاملے میں راست ہاں اور صاف گو تھے۔ انھیں جو باتیں کھٹکیں وہ بلا کم و کاست لکھ دیں۔ ہم عصر اور ایک معروضہ ادیب کی تحریر پر خیال آرائی کرتے وقت نہ اپنے ذاتی مراسم کو سہرا بنے دیا اور نہ کسی جھجک اور رعایت سے کام لیا تنقید اور تبصرے کی یہ شرط اول ہے اور راست گو نقاد ہی ایسی شرط پوری کرتا ہے۔ فی زمانہ نقاد بہت اور راست کم ہیں۔ حمید احمد خاں، جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے ایک بے باک نقاد تھے۔

دو خطوط کا سرسری ذکر کرنے کے بعد اب مرحوم کے ان آٹھ خطوط کا پس منظر بیان کرنا چاہتا ہوں جو ہم نے احتیاط کے ساتھ غالب لاہور پیری میں محفوظ کر لیے ہیں۔ ادارہ یادگار غالب جنوری ۱۹۷۵ء میں قائم ہوا۔ ادارہ

پہلی عام تقریب "تماشا اہل کرم" بدھ ۲۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو آدم جی سائنس کالج ہال، کراچی میں غالب نیپیل کی فروخت سے روپیہ جمع کرنے کے لیے فیض احمد فیض کی صدارت میں منعقد کی گئی۔ حقیقت ہوشیار پوری مرحوم نے اس تقریب کی تاریخ اس طرح نکالی تھی۔

چلے بیچنے "غالبی نیپیل"
ہوئے جمع نقد دل و جباں لیے
جو تقریب برپا ہوئی اُس کا سال
ہے "ذکر تماشا اہل کرم"
جو دیکھا تماشا اہل کرم
بر آئی تمنا اہل کرم

۱۹۶۸ء

دوسرے ہی چینی یعنی ۲۲ دسمبر ۱۹۶۸ء کو ادارے کی پہلی خاص تقریب پروفیسر حمید احمد خاں کی صدارت میں کی گئی جس میں کراچی کے بیشتر ممتاز ادیبوں شاعروں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ فروری ۱۹۶۹ء میں صد سالہ برسی کی جالے والی تھی اور اُس وقت تک پروگراموں کا خاکہ مرتب کیا جا چکا تھا جس میں سات کتابوں کی اشاعت مشاعرہ، محفل موسیقی اور نمائشیں وغیرہ شامل تھیں۔ میں نے یہ پروگرام بناتے ہوئے ادیبوں سے تعاون کی اپیل کی اور مشورے طلب کیے۔ جیسا کہ نسیم درانی نے روزنامہ جنگ مورخہ ۶ جنوری ۱۹۶۹ء میں لکھا تھا۔

عالی صاحب (مرزا جمیل الدین عالی) حال ہی میں ادیبوں کے ایک وفد کے ساتھ کئی ملکوں کا دورہ کر کے آئے ہیں۔ ان ملک میں حکومتوں کے زیر اہتمام غالب کی صد سالہ برسی پر ہونے والے اشاعتی اور دیگر پروگراموں کے تعلق و معلومات حاصل کی ہیں۔ لیکن خود اپنے ملک میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر جو خاموشی پائی جا رہی ہے اس پر عالی صاحب نے سوزش دل سے سخن گرم ادا کیا۔ انھوں نے کہا ہماری حکومت کے خیال میں غالب ہندوستانی شاعر ہے۔ اس لیے کہ وہ آگرے میں پیدا ہوا اور وہلی میں انتقال کیا اور وہیں اس کا مزار بھی ہے رھت کی بے توجہی کا ذکر کرتے ہوئے عالی صاحب نے کہا کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری دوسری زبان بنگلہ میں اس پایہ کا کوئی شاعر نہیں ہے۔ بہر حال اگر غالب صرف اردو فارسی کے شاعر تھے تو کم سے کم حکومت مغربی پاکستان ہی کو غالب کی صد سالہ برسی کے لیے سرکاری سطح پر کوئی مخصوص قدم اٹھانا چاہیے۔ یہ معاملہ اندرونی پیچیدگی و جمہوری اقدار کے ہونے یا نہ ہونے کا نہیں ہے، بلکہ یہ خالص ادبی معاملہ ہے اور حکومت تک یہ بات پہنچانے کے لیے انھوں نے بطور خاص دہان خصوصی حمید احمد خاں صاحب اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔

پروفیسر حمید احمد خاں کی صدارتی تقریر کی رپورٹ ۶ جنوری ۱۹۶۹ء کے روزنامہ حریت میں جیل کشمیری نے اس طرح لکھی۔ حمید احمد خاں صاحب نے فرمایا "اگر ہندوستان سرکاری طور پر غالب کی صد سالہ برسی منانا چاہے تو ممکن ہے ہندوستان کو سرکاری طور پر اس کی ضرورت ہو، لیکن ہم سے یہ مطالبہ کرنا کہ ہم بھی غالب کو سرکاری طور پر منوائیں، درست نہیں ہے۔ ہماری سرکار کی دہلیز تک رسائی ضرور ہے۔ لیکن ششوازی نہیں۔ ہم صرف دستک دے سکتے ہیں۔ غالب کا سانداز بیان اور اس کی ہمہ گیری مجھے دنیا کے کسی اور شاعر میں نظر نہیں آتی۔"

میں نے ”دنیا میں“ اس لیے کہا ہے کہ انگریزی زبان کے ذریعہ دنیا کے کم و بیش ہر بڑے شاعر کو پڑھنے اور سمجھنے کا بچہ موقع ملا ہے۔ لیکن غالب والی بات کہیں اور نظر نہ آئی۔ غالب ہماری ایک نہر سالہ تہذیب کا نمایندہ اور قبائل کا پیش رو تھا۔ اُس کی عظمت سے انکار کرنا اسلاف کو کھولنا اور اپنی تہذیب سے انکار کرنا ہے۔ غالب کی قدر ہی کر سکتا ہے جس نے غالب کو سمجھا ہو۔ اور جس نے غالب کو سمجھا ہی نہیں اُسے ہم مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ غالب کی قدر کرے۔ ایسے نا قدر شناس کا چپ ہی رہنا غالب کے حق میں مفید ہے۔ غالب ہی کا شعر ہے

مجبوری و دعوائے گرفتاری اُلفت

دستِ ترسنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

اعتراف یا اعتقاد یا قدر دانی میں ہم جبر کے قائل نہیں۔ کسی کا ہاتھ بھاری پتھر کے نیچے دبا کر یا شکنجے میں کس کر اس سے مصافحہ کیا جائے اور پھر یہ اعلان ہو کہ دیکھیے کیسی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا جا رہا ہے۔ محض ایک دھوکہ ہے۔ لہذا ان لوگوں کا چپ ہی رہنا بہتر ہے جو غالب کے قدردان نہیں ہیں۔ ہمیں کسی سے مالی امداد نہیں مانگنا چاہیے۔ ہم غالب پشلیں بیچ کر غالب کی صد سالہ برسی کا شاندار اہتمام کر لیں گے۔

اسی صدارتی تقریر میں غالب کے آگرے میں پیدا اور دہلی میں دفن ہونے کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے مرحوم نے فرمایا اگر پیدائش اور دفن کے مقامات کو ملحوظ رکھا گیا تو خاکِ ہند میں سونے والی بے شمار ستیوں، بزرگوں اور ملی زندگی کے محسنوں سے رشتہ توڑ دینا ہوگا۔ مگر اس کے بعد بھی بات اور آگے بڑھے گی اور وہ یہ کہ ہم حمراز کی سرزمین سے اٹھنے والے اور وہیں انتقال فرمائے والے اُس داعیِ حق سے اپنا تعلق کس طرح قائم رکھ سکیں گے کیونکہ وہ بھی تو اس جغرافیائی خطہ ارض میں تولد نہیں ہوئے جسے اب پاکستان کہتے ہیں، اور نہ آپ کا روضہ مبارک بہاول۔ فروری ۱۹۶۹ء کی ابتدائی تاریخوں میں اُس وقت کی سیاسی افراتفری کے پیش نظر طے کیا گیا کہ صد سالہ برسی مارچ میں منائی جائے۔ مشاعرے کی صدارت کے لیے حمید احمد خان صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ میں نے موصوف کو خط لکھا کہ ادارے کی درخواست قبول فرمائیں۔ آپ نے فوراً جواب ارسال کیا کہ ”۸ مارچ کو منعقد ہونے والی تقریب میں میری شرکت میرے لیے باعثِ فخر و مسرت ہوتی۔ لیکن مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالات موجودہ میرا لاہور کے باہر جانا ناممکن ہوگا۔ براہِ کرم میری معذرت قبول فرمائیے اور ارکانِ ادارہ یادگار غالب کی خدمت میں بھی میرا شکریہ پہنچا کر موجودہ صورتِ حال میں کراچی کا سفر اختیار کرنے کے معاملے میں میری معذوری کا اظہار کر دیجیے۔“ ادارہ یادگار غالب کے معاملات کے سلسلے کا یہ پہلا خط تھا۔ اور یہ خط حمید احمد خاں نے

ملک کے سیاسی حالات بگڑتے ہی چلے گئے اس لیے صد سالہ برسی مارچ میں نہ کی جاسکی اور طے ہوا کہ ماہ مئی میں کریں۔ ختم مارچ پر اپنے سرکاری کام سے لاہور گیا، مرحوم سے ملا اور انھیں ادارے کے اشاعتی پروگرام سے آگاہ کیا۔ خیال یہ تھا کہ ادارہ یادگار غالب اور جامعہ پنجاب کی مطبوعات میں کوئی ایسی کتاب شامل نہ ہو جائے جو دونوں کی طرف سے شایع ہو۔ باہمی تبادلہ خیال اور تعاون ہی طرفین کے وقت توانائی اور روپے کے ضیاع کو روک سکتے تھے۔ چنانچہ حمید احمد خاں صاحب نے مجھ سے اتفاق فرمایا کہ جامعہ پنجاب اپنے پروگرام میں پنج آہنگ کے خطوط کا ترجمہ

شامل نہیں کرے گی جو ہمارے ادارے کی جانب سے محمد عمر مہاجر کر رہے تھے اور ہم غالب کی کسی اور فاضلی تخلیق پر کوئی کتاب شایع نہیں کریں گے۔ اسی ملاقات میں میں نے مرحوم کو بتایا تھا کہ اب صد سالہ برسی کی تقریبات، رمئی سے شروع ہوں گی، مشاعرہ پہلے ہی دن ہوگا اس لیے صدارت کے لیے کراچی تشریف لائیں۔

کراچی لوٹنے کے بعد جب پروگرام کو آخری شکل دی گئی تو مشاعرے کی تاریخ، ۷ رمئی کی بجائے ۹ رمئی مقرر ہو گئی۔ چنانچہ میں نے اس تبدیلی کی اطلاع بھیجی تو حمید احمد خاں صاحب نے جواب میں لکھا۔ ”اس ترمیم سے میرے لیے ایک مشکل سی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ میں نے اس دوران میں مرکزی ترقی اردو بورڈ (لاہور) کا جلسہ ۱۷ رمئی کو مقرر کر دیا تھا ۱۷-۶ رمئی کو کراچی جا کر ۹ رمئی کی شام تک واپس لاہور پہنچ جاؤں گا..... میں مرکزی اردو بورڈ کے جلسے کی تاریخ بدل دیتا، مگر یہ تاریخ پہلے ہی دود فست بدل چکی ہے اور اب بورڈ کے ارکان مزید تبدیلی پر خوش نہ ہوں گے۔

”اگر آپ کے لیے ادارے کی تقریبات کا آغاز کسی اور تاریخ سے یہ سہولت ممکن ہو تو میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن اگر تاریخ کی تبدیلی ممکن نہ ہو سکی تو امید ہے کہ آپ میری معذرت قبول فرمائیں گے۔“ مرحوم کا یہ دوسرا خط تھا۔ میں نے صورت حال جناب فیض احمد فیض کو بتائی اور ادارے کے سرگرم کارکن پیر حجام الدین راشدی کو بھی۔ دونوں نے کہا ایک اور خط لکھو اور اصرار کرو کہ موصوف جس طرح بھی ممکن ہو ضرور آئیں۔ چنانچہ میں نے دوسرا خط لکھا کہ آپ جیسے غالب شناس اور غالب دوست کی عدم حاضری سب کے لیے باعث رنج ہوگی۔ تین دن کے اندر جواب آیا کہ ”بصورت موجودہ اس فیصلے میں ترمیم کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ ضمنیاً یہ وضاحت کر دوں کہ بورڈ کے اجلاس کی تاریخ انعقاد ممتاز حسن صاحب ہی کی فرمائش پر ۱۳ رمئی کے بجائے ۱۷ رمئی مقرر کی گئی تھی اور اب تیسری مرتبہ تاریخ کی تبدیلی بورڈ کے اکثر ارکان کو نامناسب معلوم ہوگی۔

مجھے اندر میں حالات اپنی طرف سے مکرر معذرت بھیجنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ اس موقع پر آپ کی اور کراچی کے دوسرے احباب کی ملاقات سے محروم رہنا خود میرے لیے باعث افسوس ہے۔ یار زندہ وصحبت باقی کہہ کر دل کو تسلی دے رہا ہوں۔“

اشتیاقی دلوں طرف تھا۔ ہمیں بلانے کا۔ حمید احمد خاں صاحب کو غالب کی تقریبات میں شرکت کرنے کا۔ دلوں کی اپنی اپنی مجبوریاں بھی تھیں۔ ہماری یہ کہ ایک تقریب میں کوئی تبدیلی کہیں تو اس سے بقیہ پانچ تقاریب اور ان تقاریب کی وجہ سے ڈھاکہ، ملتان، لاہور، راولپنڈی اور پشاور سے آنے والے مقررین، صدقہ اور فن کاروں کے پروگرام متاثر ہوتے۔ خاں صاحب کی مجبوری یہ تھی کہ مرکزی اردو بورڈ کا اجلاس بار بار بدلنا بورڈ کے اراکین کے لیے باعث زحمت ہو رہا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ ٹیلی فون پر طے ہوا کہ اگر مشاعرہ ۹ رمئی کی بجائے ۱۷ رمئی کو کیا جائے تو موصوف صبح بورڈ کے اجلاس میں شرکت کر کے شام کے ہوائی جہاز سے کراچی آجائیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ تشریف لائے مشاعرے کی صدارت اور دوسرے دن کی تقریبات میں شرکت کی اور پھر ادارہ یادگار غالب کی کتاب رائے میں لکھا:

”ارکان ادارہ یادگار غالب کا خلوص و ہمت سزاوار صد تحسین و آفرین ہے کہ ما

وسائل کی کوتاہی کے باوجود، اور حکومت پاکستان کی پشت پناہی کے بغیر انھوں نے پاکستان کی قومی زبان اردو کے سب سے بڑے شاعر کو اس کی صد سالہ برسی کے موقع پر شایان شان طریقے سے یاد کیا۔ اس طرح انھوں نے پاکستان کی ذہنی شائستگی اور ملک وقوم کی ہزار سالہ روایات کی لاج رکھ لی۔ سچ یہ ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی انسانی عظمت کا اعلان امریکہ اور انگلستان، روس اور ہندوستان، جیسے ممالک میں اس دھوم دھام سے ہوا کہ اگر پاکستان یا دو غالب کی ان تقریبات کے جلوس کو گونگی زبان اور بے بصر آنکھوں سے دیکھتا رہتا تو نہایت شرم کا مقام ہوتا۔ اس نازک مرحلے پر کراچی کے چند صاحب ذوق اور محبت وطن افراد جنھیں سرکارِ دربار میں رسائی نہ تھی خدا کا نام لے کر اٹھے اور غالب کا ذکر کر کے (جو دراصل تہذیب پاکستان کا ذکر تھا) پوری قوم کی زبان بن گئے۔ اس ادارے کے کس کس کا زمانے کو سراہا جائے! متعدد تقریبات اس اہتمام سے برپائیں کہ ایک دنیا نے اُن کی گونج سنی۔ تصویروں کی نمائش اس شان سے منعقد کی کہ غالب ایک بار پھر زندہ ہوا اور وہ مصور لے جس نے اپنے شاہکار اس موقع پر پیش کیے خود زندہ تر ہو گیا۔ مگر سب سے بڑھ کر تحقیقی اور تشریحی کتابوں کا وہ سلسلہ تھا جس کی اشاعت نے ثابت کر دیا کہ حالات کتنے ہی ناسازگار ہوں، پاکستان اپنی تہذیب و تمدن کے محسنوں کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتا۔

پاکستان زندہ باد، ادارہ یادگار غالب پایندہ باد۔

آخر میں حمید احمد خاں مرحوم کی ایک اور تحریک کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ بھی غالب لائبریری میں محفوظ ہے۔ لائبریری کا افتتاح یکم ستمبر ۱۹۷۱ء کو ہوا۔ ہم نے یکم سے ۷ ستمبر تک ”ہفتہ مطالعہ عبدالحق“ منایا یہ مطلب یہ تھا کہ اس مدت میں بابائے اردو کی تحریروں اور خود ان پر لکھے ہوئے مضامین اور کتابیں اس طرح ترتیب دی جائیں کہ اُس ہفتے کے قارئین کو آسانی سے مل جائیں اس سلسلے میں ادارے کے سرگرم اور مخلص کارکن سحر انصاری نے ایک مختصر کتاب ”ذکر غالب“ ذکر عبدالحق “مرتب کی جس میں مولوی صاحب کے دو مضامین کے علاوہ اُن تین سو مضامین کا اشاریہ بھی شامل ہے جو غالب لائبریری میں موجود ہیں۔

میں نے یہ کتاب مرحوم کو بھیجی تو مجھے خط لکھا:-

”آفرین ہے آپ کو مولوی صاحب کی دسویں برسی پر آپ نے سحر انصاری صاحب کے اعجازِ ترتیب

سے پُر لطف کام لیا اور مولوی صاحب کی یاد کو مرزا غالب کی یاد سے ملا دیا۔

خوشتر آں باشد کہ متر دہراں گفتہ آید در حدیث دیگران

اب یہ آپ کی نکتہ سنجی کا کمال ہے کہ آپ یہ بتادیں کہ ذکر غالب، ذکر عبدالحق میں متر دہراں ذکر عبدالحق ہے یا ذکر

غالب؟ اور حدیث دیگران ذکر غالب ہے یا ذکر عبدالحق؟“

بندم غالب کے دو چراغ۔ مولانا غلام رسول تہریشی محمد اکرام۔ کچھ ہی مدت پہلے گل ہوئے تھے کہ حمید احمد خاں کی موت نے اس کی محفل کی ایک اور شمع کو خاموش کر دیا۔ اب کہاں پیدا ہوں گے ایسے لوگ۔

لے صادقین جنھوں نے پچاس تصویریں بنائی تھیں۔

ڈاکٹر عبد السلام خورشید

حمید احمد خاں

۲۲ مارچ کو وہ دیو قامت علمی شخصیت موت سے ہم کنار ہو گئی۔ جس کی زندگی ایک مسلسل ریاض اور جہاد سے عبارت تھی۔ ایک نتھری ستھری پاکیزہ زندگی بے داغ بلکہ چمکتا دکھتا اور حکمتا کر دار نہرا رہا شاگردوں کے لیے روشنی ہمیتا علم کی منت نئی راہوں کی دریافت میں عشق و جنون کے جملہ لوازم کا مظہر، خلوص اور دیانت اور وفا کا پتلا پہیہ وہ خوبیاں ہیں جو استاذی گرامی قدر پر وفیسر حمید احمد خاں کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

میرے نزدیک حمید احمد خاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے قول و فعل میں کبھی تضاد نہ ابھرا، ان کا کردار نہایت بلند تھا۔ علمی، ادبی اور تعلیمی مسائل پر ان کی آراء نہایت جچی تلی ہوتی تھیں۔ وہ اصول کے معاملے میں کسی مصلحت اور کسی مصلحت بینی کے قائل نہیں تھے۔ اس کی خاطر انھوں نے بہت نقصان اٹھایا۔ بعض افراد کے سب بختم کے شکار ہوئے۔ عافیت کو تش احباب نے رائے میں لچک کے مشورے دیے۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے مسلک اور موقف پر چٹان کی طرح قائم رہے۔ لاریب آج کے معاشرے میں ایسی شخصیات چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں تو نہیں پائیں گے۔

حمید احمد خاں ایک مثالی استاد تھے۔ میں اسلامیہ کالج میں ان کا شاگرد تھا اور پچ پوچھے تو اتالیس سال تک شرف تلمذ سے فیضیاب ہوتا رہا۔ اور خوبی تقدیر ملاحظہ ہو کہ ان کی جان یوں ابلے ہوشی سے سرف دو گھنٹے پہلے میں نے ٹیلی فون پر ان سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر لیا۔ دوسری باتوں کے علاوہ انھوں نے اس دن کے ”لاہور نامہ“ (انتظامیہ) کا تذکرہ بہت دلچسپ انداز میں کیا۔ حمید احمد خاں کو اپنے نہرا شاگردوں سے پیارتھا اور شاگرد بھی ان پہ جان دیتے تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ اسلامیہ کالج سے وابستہ رہے۔ پہلے استاد کی حیثیت سے، پھر پرنسپل کی حیثیت سے، انھوں نے طلباء پر شفقت کی دولت بچھاو رکی۔ بہت سے طلباء کو مالی امداد دی۔ جسے سر دیوں میں ناکافی لباس میں دیکھا اُسے چپ چاپ اس قابل کر دیا کہ مناسب لباس پہن سکے۔ طلباء کی شکایات پر کان دھرتے تھے۔ ان کا ازالہ کرتے تھے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے تو اس دانش گاہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہفتے میں تین دن دو دو گھنٹے صرف طلباء کے لیے مخصوص کر دیے۔ اور انتظامیہ یا غیر عادل اساتذہ کے خلاف شکایات توجہ سے سنتے رہے اور ان پر فوری اور مؤثر کارروائی

کرتے رہے۔ لیکن وہ ایک چیز نا پسند کرتے تھے۔ اور وہ تھی طلباء میں ٹریڈ یونین ازم۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ درس گاہوں میں نظم و ضبط کے سلسلے میں ”فاندائی تصور“ کے قائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہر درس گاہ ایک خاندان کی حیثیت رکھتی ہے۔ طلباء اور اساتذہ اس خاندان کے افراد ہیں۔ درس گاہ کے سربراہ کا فرض ہے کہ تمام افراد کے حقوق کا خیال رکھے اور سب سے پیار کرے۔ بچے ضد کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی ان کی ضد مانی بھی جاسکتی ہے۔ لیکن جس طرح ایک خاندان میں بھرتال نہیں ہوتی۔ اسی طرح درس گاہ میں بھرتال بھی ایک غلط حربہ ہے اور نہ درس گاہ میں اجتماعی سودے بازی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دورانیہ میں اس تصور کی بدولت اور نوکرتشاہی کی ریشہ دوانیوں کے سبب سے انھیں والس چائلز شپ سے مستعفی ہونا پڑا۔ وہ دن اور آج کا دن درس گاہوں میں ٹریڈ یونین ازم کا دور دورہ ہے اور اس کے نتائج ظاہر ہیں۔ موت سے پہلے انھوں نے اپنے تعلیمی خطبات کا ایک مجموعہ ”تہذیب و تعلیم“ کے نام سے مرتب کر لیا تھا جب یہ چھپ جانے کا تو شاید آج کے ارباب حکومت اور ارباب دانش اس سے روشنی اخذ کر سکیں۔

حمید احمد خان ایک ہمہ جہتی شخصیت کے ایک تھے ادب کی مختلف اصناف اور علم کی مختلف شاخوں میں انھیں اتنا ادراک حاصل تھا کہ ہر موضوع پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کر سکتے تھے۔ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ جس مجلسی تقریب کی صدارت فرماتے۔ ایک مختصر سے صدارتی خطبے میں جو باتیں کہتے وہ بھاری بھر کم مقالات سے زیادہ وزنی ہوتیں۔ یہ خوبی میں نے صرف دو بزرگوں میں دیکھی ہے۔ ایک سر شیخ عبدالقادر جناب منظور قادر کے والد میں دوسرے مسٹر جسٹس ایس۔ اے۔ رحمن ہیں۔

علمی تحقیق میں جس گریڈ اور جنون کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ حمید احمد خان میں بدرجہ وافر موجود تھے۔ چنانچہ غالب پر تحقیق ہو یا اقبال پر انھوں نے معلومات کی جستجو میں انتہا کر دی۔ غالب پر تحقیق تو اس وقت سے جاری تھی جب ہم کالج میں پڑھتے تھے اب وہ اس پوزیشن میں تھے کہ تحقیق کے نتائج کو کتابی صورت میں پیش کریں۔ لیکن شاید قدرت کو ایسا منظور نہیں تھا پنجاب یونیورسٹی ہر سال کسی ممتاز شخصیت سے اقبال پر لیکچر کراتی ہے۔ اس سال یہ لیکچر ریورس حمید احمد خان کو دینے تھے اور انھوں نے مسلسل محنت شائستہ سے کام لے کر یہ لیکچر تیار کر لیے تھے کہ موت کا ہلا دوا لگیا۔

حمید احمد خان انگریزی ادب کے استاد تھے۔ لیکن اردو زبان کو فروغ دینے میں انھوں نے پوری عمر بسر کر دی۔ بی۔ اے اور بی۔ ایس۔ سی میں اردو کو زیر تعلیم قرار دیا۔ تو انھوں نے ایم۔ اے اور ایم۔ ایس۔ سی میں اساتذہ کو اردو میں لیکچر دینے کا حق حاصل ہوا تو انہی کی بدولت ایم۔ اے اور ایم۔ ایس۔ سی میں طلبہ کو امتحانات کے پرچوں میں اردو میں جواب لکھنے کا حق ملا تو انہی کی کوشش سے غرض اردو کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے تعلیمی دائرے میں جتنے بڑے قدم اٹھائے گئے ان کا سہرا حمید احمد خان ہی کے سر ہے انہی کے زلمے میں پنجاب یونیورسٹی کی انتظامیہ میں فائلوں پر اردو میں نوٹ لکھنے کی رسم کا آغاز ہوا۔ ایک بات اور یاد آگئی پہلے یہ دستور تھا کہ جو لوگ نجی طور پر پڑھ کر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھیں پہلے علوم شرقیہ کے امتحانات پاس کرنے پڑتے تھے اور پھر ڈگری کے لیے صرف انگریزی کا۔ حمید احمد نے بندوبست کر دیا کہ لوگ تمام غیر پیشہ ورانہ امتحانات پر انیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کرنے لگے اس سے ان لوگوں پر بھی تعلیم کے دروازے کھل گئے جو کسی درس گاہ میں داخلہ لینے اور اس کے مالی لوازم پورے کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اردو زبان سے لگا کا یہ عالم تھا کہ زیادہ تر نجی گفتگو بھی اردو میں کرتے اور بچوں کو بھی اردو کی تربیت ایسی دے رکھی تھی کہ جب بھی کوئی ٹیلیفون کرتا اور کوئی بچہ ریسورسٹا تھا تو فوراً آواز آتی چھ پانچ پانچ سات سات ایہ رسم میں۔ اور کسی کے ہاں نہیں دیکھی۔

دارت میر

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم

پروفیسر حمید احمد خاں "ایک ٹھیک استاد" تھے ایک ایسے استاد جو ذہن جدید اور قلب قدیم کے گونا گوں محاسن کا امتزاج تھے۔ انگریزی زبان و ادب کے گہرے مطالعے اور کیمبرج یونیورسٹی سے ایم لٹ ہونے کے باوجود ان کی مشرقی شخصیت اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑی رہی۔ وہ انگریزی لباس پہنتے اور ضرورت پڑنے پر بڑی عالمانہ انگریزی میں تقریر بھی کرتے تھے لیکن "مغربیت" کی ایک بوند بھی ان کی دل کی دنیا تک نہ پہنچ سکی تھی۔ وہ جذباتی وابستگیوں اور ناوابستگیوں کے قائل تھے۔ ان کی پسند اور نا پسند ہمیشہ شدید ہوتی تھی۔ شعلہ بھی تھے اور شبنم بھی۔ دوستی اور ناخفگی کے اظہار میں ریاکار نہیں تھے۔ ٹوپو میسی اور مصلحت شناسی کے "جوہر" سے کلیتاً محروم تھے۔ عملی زندگی میں یہی ان کی خوبی تھی اور یہی ان کی کمزوری۔ اس خصوصیت کی بنا پر وہ اپنے دوستوں میں محترم اور باوقار تھے اور اسی کمزوری کی بنا پر وہ حاکموں کے اعتماد کو زیادہ عرصہ تک نبھانے سکتے تھے۔ اسلامیہ کالج کی پرنسپل کے زمانے میں ایک کامیاب منتظم کے طور پر بہت نیک نام ہوئے۔ یونیورسٹی میں وائس چانسلر ہو کر آئے تو ان کے مخصوص تعلیمی نظریات اور انتظامی رویہ پر طلبہ کی طرف سے سخت گیری کا الزام لگایا گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اسلامیہ کالج کا ایک متعین مزاج اور روایات تھیں۔ آپ نے اس ادارے کو اس کے مزاج اور روایات کی روشنی میں کامیابی سے چلایا اور تعلیمی و حکومتی حلقوں میں اپنی صلاحیتوں کی دھاک بٹھائی۔ یونیورسٹی کی وائس چانسلری بنیادی طور پر ایک سیاسی عہدہ تھا۔ یہاں انھیں طلبہ، اساتذہ اور حکومت کے بیچ در پیچ سیاسی مفادات کے باہمی تصادم کا سامنا کرنا پڑا۔ مزاجی سیاست داں یا ڈپلومیٹ نہیں تھے بیدھ کھرے اور نہ ہی انھیں نفس استقامت تھی۔ اور استاد کا منصب بہت سی خوبیوں کے علاوہ ایک کمزوری کا حامل بھی ہے کہ اس پیشے سے وابستہ شخص ہر فرد شتا گردوں جیسی اطاعت کا طلب گار رہتا ہے۔ آپ علے سے تعاون، اصول پسندی اور فرض شناسی کے جس معیار کے خواہاں تھے وہ نہ ملتا تو اکثر جھجھلا اٹھتے۔ اور یونیورسٹی کے بڑے سے بڑے افسر کو سب کے سامنے بھاڑ پلا دیتے اور پھر فوراً ہی تالیف قلب کے لیے بھی تیار ہو جاتے تھے لیکن اپنے سے بڑے حاکم یا افسر کو ناراض کر لیتے تو اسے منائے کا "فن" وہ نہیں جانتے تھے۔ وائس چانسلری کے ابتدائی زمانے میں انھیں طلبہ کے خوفناک ہنگاموں کا سامنا کرنا پڑا۔ پولیس یونیورسٹی کمپس کے سامنے پولیس اور طلبہ میں فحشت باری کا زبردست مقابلہ تھا۔ صورت حال قابو میں نہ آسکی تو پولیس نے یونیورسٹی کے اندر گھس کر طلبہ کی پٹائی کی طلبہ نے وائس چانسلر سے احتجاج کیا۔ حمید احمد خاں نے وائس چانسلر کی اجازت کے بغیر یونیورسٹی کمپس میں پولیس کے گھس لے کی مدت کی اس وقت کے گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خاں، پروفیسر صاحب سے سخت ناراض ہو گئے اور جب تک حمید احمد خاں وائس چانسلر رہے، ملک صاحب نے یونیورسٹی کے کسی کالوگیشن میں شرکت نہ کی۔ یونیورسٹی میں ان کی نمائندگی ملک خدا بخش کچہ کیا کرتے تھے۔ ملک امیر محمد خاں وضع دار دشمن تھے انھوں

نے اپنی ناراضی کو آخر وقت تک قائم رکھا۔ لیکن اس ناراضی کو والٹس چانسلی کی برطرفی کا بہانہ نہیں بنایا۔ حمید خاں نے اپنی وضع کردہ یوں سمجھا کہ ملک صاحب نے گورنری سے استعفا دیا تو سب سے پہلے آپ نے انھیں ایک محبت بھرا خط لکھا۔ جنرل موسے نے بحیثیت چانسلیر کا تو کیشن ایڈریس انگریزی کی بجائے اردو میں پڑھنے سے انکار کر دیا۔ تو حمید احمد خاں نے ان کے بغیر ہی اس تقریب کا انعقاد کیا، اور یوں نئے چانسلیر کی بھی ناراضی مول لی۔

حمید احمد خاں سلامیہ کالج میں پرنسپل تھے۔ ذرا حسن چیف سیکریٹری تھے۔ پرنسپل کی اجازت کے بغیر کالج کے ہوٹل میں پولیس گھسائی تو حمید احمد خاں نے چیف سیکریٹری کو نہایت سخت احتجاجی خط لکھا۔ جواب میں چیف سیکریٹری نے معذرت طلب کی۔ پروفیسر صاحب نے دونوں خط لائٹس بوٹ پر چسپاں کر دیے۔ اپنے کالج کی عظمت کے احساس سے خود سرشار تھے، اور طلبہ کو بھی سرشار رکھتے جب کبھی انسانی قدروں کے احترام میں مثلاً لوہے کے قتل پر طلبہ نے جلسوں نکالا تو کالج کا جھنڈا حمید احمد خاں نے خود طلبہ کے ہاتھ میں تھمایا۔ مجلس ترقی ادب کے دائرہ کار کی حیثیت میں آپ نے سکریٹریٹ میں ڈپٹی سیکریٹری یا جوائنٹ سیکریٹری کی سطح کے لوگوں کے دفتر میں حاضری دینے سے یہ کہہ کر ہمیشہ انکار کیا کہ میں ایک ادبی تحقیقی ادارے کی کارکردگی کے سلسلے میں چھوٹے موٹے سرکاری افسروں کا مشورہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ وہ اس لئے گزرے دور میں علم کی غیرت کا نشان تھے۔ گزشتہ سال پہلی کالج آف کامرس کے سالانہ جلسہ میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے آپ نے جس دردمندی سے پاکستان بنانے والی نسل کی ناکامیوں اور حسرتوں کا ذکر کیا اور جس جرأت اور عریضی سے ”پنج بولنے“ کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے نئی نسل کو خواب غفلت سے جھنجھوڑنے والی باتیں کیں۔ اس سے ان کے مقاصد پاکستان سے بے پناہ محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ جلسے میں موجود اساتذہ اور طلبہ کو تشویش تھی کہ خاں صاحب جذبات سے مغلوب ہو کر کہیں اپنی ملازمت سے استعفا نہ دھو بیٹھیں۔ دو ماہ پیشتر مجلس ترقی ادب کی ایک تقریب میں صوبائی وزیر تعلیم کی صدارت پر بیٹھے تھے۔ خاں صاحب نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال سے وابستہ پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بڑے زور شور سے اور بار بار حکومت اور اہل پاکستان کو شجر اسلام سے پیوستہ رہنے کا مشورہ دیا۔ محفل میں شریک اکثر بزرگ فکر مندی سے سرگوشی کر رہے تھے۔ یہ خاں صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ اس حکومت کے وزیروں کے سامنے اسلام کا ذکر اتنی عقیدت سے کر رہے ہیں خدا خیر کرے۔ یہ لوگ تو اس لفظ کو اپنی چوڑی سمجھتے ہیں اور خاں صاحب بار بار اسی لفظ کا ہتھوڑا چلا رہے ہیں۔

کالج کے زمانے میں حمید احمد خاں کی شخصیت کا طرہ امتیاز طلبہ میں ان کا احترام تھا۔ ان کے ناقدوں کا کہنا ہے کہ یونیورسٹی میں آپ طلبہ سے اس لیے شکست کھا گئے کہ آپ کا رویہ آمرانہ تھا۔ لیکن مرحوم کے متعلق یہ رائے قائم کرنا قریب انصاف نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ استاد اور شاگرد کے رشتوں کی تیزی سے بدلتی ہوئی نوعیت اور سیاسی خلفشار سے جنم لینے والی بد اعتمادی کے ساتھ خاں صاحب کے اصول دہنی طور پر سمجھوتہ نہ کر سکے، ورنہ ان کے متعلق ایسے کسی واقعات سننے میں آئے ہیں، کہ کسی گستاخ طالب علم کو مزا دینے کے فوراً بعد ان کا دل بیچ جاتا اور وہ اس کی فیس معاف کرنے کے علاوہ کتا میں تک مفت خرید دیتے۔ والٹس چانسلی کے زمانے میں جن چیر اسمیوں اور ڈائریٹروں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے، وہ ان کی درپیش طبیعی، اقوام آدمیت اور غریب پروری کی کئی داستانیں سناتے ہیں۔ اور یہ دل خراش نظارہ تو کئی اساتذہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ طلبہ پھرتے ہوئے ان کے دفتر میں داخل ہوئے کچھ کیوں کے شیشے اور فرنیچر توڑ دیا۔ پردے پھاڑ ڈالے اور خاں صاحب

کے سامنے پڑی میز پر چڑھ کر ناپچے کودتے اور نعرے لگاتے رہے۔ اس طوفان بدتمیزی کا خاں صاحب نے کمال تحمل سے سامنا کیا، کسی لڑکے کو کچھ نہیں کہا اور اپنے چہرے کو ہتھیلی پر جمائے خاموشی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ رہے۔ لڑکے ٹھک ہار کر چلے گئے تو آپ کرسی سے اٹھے۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں اور پچھٹے ہوئے پردوں کو جمع کیا۔ منگائے میں پیش پیش چند طالب علموں کے والدین کو بلایا اور ان سے گزارش کی ”بچے میرے دفتر کا یہ حال کر گئے ہیں۔ یونیورسٹی میں یہ میرے بچے ہیں ان کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ لیکن گھروں میں ان کی حفاظت کرنا اور قابو میں رکھنا آپ کا فرض ہے۔“ شہر میں طلبہ کے جلوس پر لڑائی چارچ ہو رہا تھا۔ گولی چلی تھی، اور ایسے محذو ش حالات میں وائس چانسلر کو اپنی جان کی خیر منانا چاہیے تھی۔ لیکن طلبہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ان کا ”حریف“ حمید احمد خاں وائس چانسلر شام کے وقت اپنی بیگم کے ہمراہ انارکلی میں بڑے سکون کے ساتھ شاپنگ میں مصروف ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں نے اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں علمی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں بہت دلچسپی لی۔ اور یونیورسٹی میں متحدہ تحقیقی اداروں (خاص طور پر شعبہ تاریخ ادبیات) کو قائم کیا۔ ریسرچ، جرنل اور یونیورسٹی کرائیکل کا اجرا کیا۔ سماجی یا سائنسی علوم سے متعلقہ ہر اجلاس میں یہ نفس نفیس شرکت کرتے اور شرکت سے پیشتر بڑے اہتمام سے ایجنڈے کے مختلف نکات پر تیاری کرتے۔ ہر فائل خود پڑھتے اور فیصلوں کو دفتری بھول بھلیوں کا شکار ہونے سے بچاتے۔ چینی میں ایک بار مختلف شعبوں کا چکر لگاتے اور ان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ پروفیسر صاحب کو یونیورسٹی میں پڑھنے اور پڑھانے والوں کو دوسروں سے الگ منفرد اور باوقار دیکھنا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے عہد میں ہر طالب علم اور استاد کے لیے سیاہ گون پہننا لازمی تھا۔ یونیورسٹی کی طالبات کو بعض اخلاقی حدود کا پابند رکھنے کے سلسلے میں وہ کسی نرمی یا رورعایت کے روادار نہ تھے۔ یونیورسٹی کی دعوت پر ترکیہ کا دورہ کر کے واپس آئے تو یونیورسٹی میں اپنے رفیقان کار کو بلا کر پوری روداد سفر سنانی اور ترکیہ میں پاکستانی سفارت خانے کے ایک ذمہ دار امریکی شراب نوشی اور خمر مستیوں کا ذکر کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ پاکستانی سفارت خانوں کو ایسے افراد سے نجات دلائی جائے جو بیرونی ممالک میں قوم کی رسوائی کا باعث بنتے ہیں۔ اسلامی ممالک کی ایک کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کر کے واپس آئے تو مسئلہ کشمیر کے بارے میں عربوں کی بے حسنی اور غیر ہمدردانہ رویے پر اخبارات میں باقاعدہ بیان چھپوایا اور دفتروں کی اس رائے پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ حمید احمد خاں اور سیاست دو مختلف چیزیں ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی کے نظام درس و تدریس میں۔ اردو کو اس کا جائز مقام دینے کا سہرا پروفیسر حمید احمد خاں کے سر نہ بٹھا ہے۔ سنڈیکیٹ نے اساتذہ کو ایم۔ اے کی سطح پر ہر مضمون اردو میں پڑھانے کا اذن عام دیا، اردو کو درجہ اظہار بنانے والے اساتذہ آپ کو محبوب رہے اور اکثر محفلوں میں ایسے اساتذہ کی تعریف کرتے، دفتری کاغذات پر اکثر اردو میں لکھتے اور اپنے عمل کو بھی ترغیب دیتے کہ غلط انگریزی میں خط ورافٹ کرنے سے بہتر ہے کہ اردو میں خط و کتابت کی جائے، ان کے تعلیمی نظریات ملی مقاصد کے فروغ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اسی لیے ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ جب تک فلسفہ، سائنس، تاریخ اور دوسرے سماجی علوم کی تدریس انگریزی زبان کی قید سے آزاد نہیں ہوتی، قوم کی تخلیقی شخصیت کا اظہار نہیں ہو سکتا، کیمرج میں انھوں نے دروزورت پر تحقیقی کام کیا تھا، لیکن ان کی علمی دلچسپیوں کا مرکز غالب، حالی اور اقبال کا فن تھا۔ حالی اور اقبال کے کام نے ملی مقاصد سے حمید احمد خاں کی محبت و عقیدت کو مستحکم کیا، اور غالب کے مطالعہ نے مرحوم کی شخصیت میں شگفتگی طبع، عقلیت

اور حکمت آرائی کی خوبیوں کو پروان چڑھایا، نسخہ حمید یہ اور ارمغانِ حجاز تو شایع ہو کر صاحب ذوق حضرات سے داد وصول کر چکی ہیں، لیکن آخری ایام میں مرحوم نے اقبال کی شخصیت و فن کے علاوہ غالب پر انگریزی میں بھی ایک کتاب لکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔

خان صاحب کا شمار پاکستان کی ایسی چند فاضل ہستیوں میں ہوتا تھا جنہیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اظہارِ مدعا پر قدرتِ کاملہ حاصل تھی، اور اظہارِ مدعا بھی اس خوبصورتی اور سلیقہ سے کہ ہر فقرے کا، ہر لفظ اپنے مقہومِ معانی کی تمام نزاکتوں اور گہرائیوں پر محیط ہوتا، کوئی لفظ کم نہیں، کوئی لفظ فالتو نہیں۔ ان کی تقریر سنتے ہوئے یوں محسوس ہوتا کہ ایک فقرے کی ترتیب میں ان کے ذہن کو اتنی ہی کاوش کرنی پڑی ہوگی جتنی کاوش کہ اس ایک فقرے میں کارفرما تصور کو واضح کرنے کے لیے کسی مقالہ نگار کو کرنی پڑتی، ان کے لہجے کا اعتماد اور آواز کا کراہین، ایک ایک لفظ کو سامعین کے دلوں میں ترازو کرتا چلا جاتا۔ انھوں نے زندگی میں بے پناہ پڑھا ہے، لیکن بہت کم لکھا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے وہ عام بیانیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ فکر انگیز اور گہرا نقد ہے، وہ محض لکھنے کی خاطر پڑھنے کے قائل نہیں تھے جو کچھ پڑھا ان کی شخصیت نے اسے اپنے اندر جذب کیا، چنانچہ علم ان کی نش و نش سے پھوٹتا تھا، اور تحریر ان کا نام نہ ہونے کے باوجود علم کی دنیا میں ان کا شمار خوش بختوں اور بہرہ وران میں ہوتا تھا، خان صاحب کی شخصیت کا ایک قابل ذکر پہلو ان کا بہت زیادہ حساس ہونا تھا، یونیورسٹی سے گئے تو اس بورڈ سے اپنا نام کھرچوانے کا حکم دیدیا، جس پر ماضی کے تمام دانش چانسلروں کے ناموں کی فہرست درج ہے، بڑے دکھ کے ساتھ کہا کرتے تھے۔

”طالب علموں کی خواہشات کے آگے حکومتیں اسی طرح مرجھاتی رہیں، تو ایک دن یہ ملک ان ہی کے ہاتھوں تباہ ہوگا، علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کے تعین کے سلسلہ میں ان کے موقف کو حکومت نے تسلیم نہ کیا تو اسے بھی انھوں نے دل پر لگا لیا، ہر حساس اور صاحبِ دل شخص کی طرح دوستی اور تعلق خاطر کے معاملات میں خان صاحب ”برتر از اندیشہ سودوزیاں ہے زندگی“ کے فلسفے کے قائل تھے اور اس فلسفے کے تحت سے

دورے پہ کی نگاہ تو اختر بنا دیا

رفعت میں مہر و ماہ کا ہمسر بنا دیا

فیضِ رسانی اور سرپرستی کی اس خوبی نے ان کے بدخواہوں میں بھی اضافہ کیا، اسلامیہ کالج کے متعدد اساتذہ یونیورسٹی میں خان صاحب کی وساطت ہی سے پہنچے ہیں۔ خان صاحب یکے مسلمان تھے، لیکن اپنی معاشرتی زندگی میں وہ کتنے وسیع المشرب اور فیض رساں مسلمان تھے۔ اس کا اندازہ جنازہ میں شریک مختلف العقائد لوگوں کے غم فائدہ کو دیکھ کر ہوا، عوامی سیاست کاری کی کامیابی کے بعد ہیبت سے دوسرے دانشوروں کی طرح وہ اپنے مسلمان ہونے پر کبھی نہیں شرمائے، اور اسی لیے رجعت پسندوں کے ساتھی، تصور کیے گئے۔ لیکن اس دنیا سے فانی سے رخصت ہوتے تو لاہور کا ہر قابل ذکر۔ ”عوامی دانشور“ ان کے جنازہ میں شریک نظر آیا!

مقبول جہانگیر

شرق و مغرب کی خوبیوں کا حسین امتزاج

حمید احمد خاں کو مرحوم کہتے اور لکھتے دل اور قلم دونوں کا کلیجہ کا پنتا ہے۔ بظاہر کتنی زندگی تھی اُن میں اور اس زندگی میں عزم و عمل کا کتنا حسن سمٹ آیا تھا۔ جنہوں نے حمید احمد خاں کو کبھی نہیں دیکھا، اُن سے کبھی نہیں ملے، وہ کیا جانیں گے کہ کیا چیز گرم ہوئی ہے۔ اس دُپٹے پتلے اوسط قامت پیکر آب و گل میں حرارت، حرکت اور توانائی کا کتنا بڑا خزانہ پوشیدہ تھا۔ ایسا خزانہ جو کسی اچھے نصب العین اور کسی عمرہ مقصد کی خاطر صرف ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جو اپنی ذات کی فحی کر کے، دوسروں کی فلاح، دوسروں کی بہبود کے لیے زندگی وقف کر دیں اور پھر اس کا صلہ بھی کسی سے نہ چاہیں، ہمارے معاشرے میں کتنے ہیں؟ دور دور تک دیکھیے پھر احساس ہوگا، کیسی قیمتی متاع ہم سے چھینی گئی ہے۔ پھر ایک معلم کا رخصت ہو جانا اور بھی قیامت ہے۔ معلم جو ہمارے ہاں کمیاب ہی نہیں، نایاب ہیں بالکل ایک سچے دوست اور کیمیا اور رہنما کی طرح سارا ماتم اس کا ہے کہ ابھی تک ہم نے معلم کو شناخت نہیں کیا کہ اس کا مرتبہ کیا ہے؟ اس کی اہمیت کتنی لازم ہے! اس کی ضرورت کیسی شدید ہے؟ اس کے احترام کے تقاضے کیا ہیں؟ اس کا حق کیا ہے؟ پھر ایسا معلم جو من کل الوجہ انسان بھی ہو، پیغمبری کے درجے سے کس قدر قریب ہے، اس سے بھی کہ وہ پیغمبر کے علوم کا وارث ہوتا ہے۔ کیا ہر پیغمبر انسانیت و آدمیت کا کامل نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین معلم نہیں تھا؟ مرحوم کا یہی ایک صفت اس قابل ہے کہ اس کے سامنے سر نیاز جھکا دیا جائے۔

یوں، دنیا اور دنیا واسے اپنے اپنے راستے پر دوں دوں رہتے ہیں۔ نا نقط واقعی لسان الغیب ہیں، کیا خوب فرمایا ہے۔

زمانہ جام بدست و جوازہ بردوش است

کوئی آتا ہے، کوئی بجاتا ہے، موت، برحق ہے، ہر ایک کے لیے، اس کا جو لمحہ مقرر ہے، اس میں تاخیر نہ تقدیر، ہنر یا یہ کہنا کہ کسی کی موت بے وقت ہوئی ہے، محض رسمی سی بات ہے۔ ہر موت بروقت ہے، اور خدا کی حکمت و مشیت کے بالکل مطابق۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہم خوش فہمی سے زندگی کو یقینی سمجھتے ہیں حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

مرحوم سے میری ملاقات کئی بار ہوئی اور ہر بار یہی تاثر رہا کہ ایک پڑھے لکھے اور شریف انسان کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا اور کچھ نہ کچھ سیکھ کر ہی اٹھا۔ ادلیں ملاقات ۱۹۶۳ء میں ہوئی جب کہ مرحوم پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اس وقت سے اُن کے اندر عونت پیدا نہیں کی تھی اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ان کی رگوں میں نجیب الطرفین خون دوڑ رہا ہے۔ وہ جتنی بار بھی ملے، خندہ پیشانی سے ملے۔ اپنی مصروفیت کا کوئی ذکر نہیں کیا جیسا کہ آج کل ہر بڑے آدمی کے ہاں اُس کا نزو

کرنا فیشن میں داخل ہے۔ شام ہمدرد میں بارہا انھیں دیکھے، اُن سے ملنے اور ان کی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ ایک بار مرحوم شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے ہمراہ اُن کے دولت کدے پر بھی حاضر ہوا اور دوڑھائی گھنٹے تک نشست رہی۔ ڈھائی تین سال قبل نقاش فطرت حضرت میاں ایم۔ اسلم کے دولت کدے پر بھی اُن سے ملاقات ہوئی۔ اُن دنوں ملک میں عام انتخبات ہوئے والے تھے اور ہر طرف ان کا چرچا تھا۔ میاں صاحب موصوف نے شام کو چائے پر جن مہمانوں کو مدعو فرمایا، اُن میں حضرت حفیظ جالندھری اور حمید احمد خاں مرحوم بھی شامل تھے۔ یہ نشست بہت پر لطف رہی حفیظ صاحب نے اپنا تازہ کلام عطا فرمایا، کچھ باتیں سیاسی ہوئیں، کچھ ادبی۔

مرحوم کے مزاج میں لطافت، بلکہ یوں کہیے کسی قدر نزاکت تھی۔ ایسی نزاکت کہ بقول انشا رب

نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

اس لطافت و نزاکت نے مل کر اُن کی طبیعت میں حد درجہ نفاست پیدا کر دی تھی۔ بے ڈھنگی چیز بے ہودہ بات یا بے اصولی سے اُنھیں وحشت ہوتی تھی۔ اس نفاست طبع اور لطافت مزاج کی بدولت وہ بہت سوں کی نظریں غیر پسندیدہ شخصیت بن گئے تھے۔ بعض نزدیکان بے ہوش کو اُن کے چہرے پر علم نظر نہیں آتا تھا بعض انھیں کبر و عجب کا مریض سمجھتے تھے۔ اور چونکہ کم گوئی اُن کی فطرت تھی، لہذا طے کر لیا گیا تھا کہ وہ غرور و نخوت میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ وہ سبھی انسان تھے۔ پاک، صاف، مقطر، معطر۔ جن سے اُن کا دل ملتا اُن سے بڑھ کر ملتے۔ درخویاں اُن کی نگاہ میں قابل التفات تھیں خواہ کسی میں پانی جائیں۔ شرافت اور علم کسی کی شرافت کا علم ہو جاتا تو اس کی بڑی قدر کرتے۔ کوئی عالم بوسیدہ کپڑوں میں پٹا ہوا اُن کے پاس چلا آتا، تو خندہ پیشانی سے پذیرائی کرتے اور احترام میں اس کے آگے کچھ کچھ جاتے۔ ایک مرتبہ شام ہمدرد میں میں نے دیکھا۔ ایک بہت بڑے سرکاری افسر، جو اچھے ادیب بھی ہیں، حمید احمد خاں سے باتیں کر رہے تھے۔ کہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی مرحوم اپنی درویشانہ وضع میں ان کے قریب پہنچے۔ حمید احمد خاں فوراً اُن کے احترام میں کھڑے ہو گئے اور سرکاری افسر سے گفتگو قطع کر کے دیر تک شیخ صاحب مرحوم کی مزاج پرسی کرتے رہے۔

وہ انگریزی کے پروفیسر تھے۔ انگریزی زبان اُن کا اوڑھنا بچھونا ہی، لیکن بائیں ہمہ وہ اردو کے عاشق تھے۔ جب بولتے اور برجستہ تقریر کرتے تو کیا جمال انگریزی کا کوئی لفظ بھولے سے بھی زبان پر آجائے۔ انھیں اپنے لب و لہجے پر حیرت انگیز قابو تھا۔ کوئی اُن کی باتیں دل کے کالوں سے سُنتا تو اقرار کرتا کہ یہ ایک شریف اور اچھے آدمی کا لب و لہجہ ہے جس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو اور چاندنی کا نکھار ہے۔ کبھی کبھی یہ نکھار اور یہ خوشبو تلواری کی دھار بھی بن جاتی تھی۔ ایسی دھار جو نولا اور ریشم دونوں کو کیساں صفائی سے کاٹتی چلی جاتی ہے۔

اُنھوں نے جدوجہد آزادی کے ایک پورے دور کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے دیکھا تھا۔ خود اُن کے سب سے بڑے بھائی مولانا ظفر علی خاں جدی خوالوں کے اُس قافلے کے سالاروں میں سے ایک تھے جو برصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا جلی عنوان سمجھے جاتے تھے۔ یعنی مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی، شوکت علی وغیرہم۔ حمید احمد خاں نے ان سب شخصیتوں کو دیکھا اور اُن کا بے پناہ اثر قبول کیا تھا۔ پھر ان کو استاد بھی ایسے ملے کہ ایک ایک شخص اپنی ذات میں انجمن تھا ان میں ہندو، مسلمان، اور انگریز بھی شامل تھے۔ مولانا عبدالباقی ندوی، مولانا

مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، رپورٹر ماس گریم پیلی، پروفیسر مدن گوپال سنگھ، پروفیسر لینگ ہارن اور ڈاکٹر ویلیٹی۔ حمید احمد خان کی عمر چھ سال کی تھی کہ اُن کے والد مولوی سراج الدین احمد خان رحلت کر گئے، اوریوں یتیمی کی دولت حمید احمد خان کے حصے میں آئی۔ قدرت جب کسی کو کچھ بنانا چاہتی ہے تو اپنی عادت کے مطابق سب سے پہلے اُسے یتیمی کی دولت سے نوازی ہے۔ یتیم ہونا بد نصیبی کی علامت ہرگز نہیں ہے۔ جیسا کہ ہمارے معاشرے میں سمجھ لیا گیا ہے اور یتیموں کے لیے ہمارے پاس سوائے یتیم خانوں اور ترس کھانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ قدرت کا واضح اشارہ ہے کہ یتیم بچے جو کچھ حاصل کرے، اپنے زور بازو سے حاصل کرے اور خدا کے علاوہ اس کا حامی و مددگار کوئی نہ ہو تا رہے کائنات کا فیصلہ تو کم از کم یہی ہے کہ اس دنیا کو انہی لوگوں نے سہارا دیا ہے جن کا کبھی کوئی سہارا نہ تھا۔

اپنے والد کی دھندلی دھندلی صورت اور یا حمید احمد خان کا کل سرمایہ تھی۔ وہ شخصیت جس نے اُن پر بھرپور اثر ڈالا وہ اُن کی والدہ تھیں اپنی والدہ سے انھوں نے یہ بھی سیکھا کہ نیکی اور نیک کام بہت بڑی متاع ہے۔ دوسروں کے کام آنا اصل عبادت ہے اور شرفِ انسانیت۔ شعور بچہ ہوا تو انھوں نے بڑے بھائی مولانا ظفر علی خان کو دیکھا جن کی تحریر و تقریر کا غلغلہ پورے برصغیر میں تھا۔ مولانا سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ حمید احمد خان کے اردو اسلوبِ تحریر میں کچھ نہ کچھ جھلک مولانا ظفر علی خان کے اسلوب کی دیکھی جاسکتی ہے۔

انھوں نے ایک خالص اسلامی اور مشرقی تہذیب سے رچے بسے گھرانے میں جنم لیا تھا اور اگرچہ بعد میں معاش کی وجہ سے اُن کا رہن سہن اور بول چال انگریزی معاشرت میں ڈوب گیا تھا۔ تاہم اُن کا دل ہمیشہ مشرق رہا اور دماغ مغربی۔ وہ مغرب کی بہت سی اچھائیوں کے شدت سے قائل تھے اور چاہتے تھے کہ جو خوبیاں اہل یورپ میں ہیں، وہ مسلمانوں کو ضرور اپنائینی چاہئیں اس لیے کہ وہ انہی کے گھر سے وہاں گئی ہیں۔ مثلاً پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی، انسان دوستی، دیانت داری، نظم و ضبط وغیرہ۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے قیام انگلستان کے بہت سے واقعات مختلف محفلوں میں سنائے اور بجا اپنے مضامین میں سموئے بھی۔

وہ عہدوں اور مناصب کے پیچھے بھاگنے والے آدمی نہ تھے اور نہ ان کے حصول کے لیے کوئی شرمینہ جوڑ توڑ کرتے تھے۔ بلکہ ان سے حتی الامکان کتراتے اور گھبراتے تھے۔ اُن کا اصل ذوق معنوی کا تھا۔ تعلیم و تدریس کے صیفے میں انھیں روحانی سترت ملتی تھی۔ وہ طالب علموں پر بڑے شفیق اور مہربان تھے۔

حمید احمد خان کا ذکرنا تمام رہے گا، اگر کچھ تھوڑا سا ذکر اُن کے اُستاد عالی مقام حضرت مولانا عبدالباقی ندوی کا نہ کیا جائے۔

مولانا ندوی ادام اللہ ظلہ کی ہستی مغفرت روزگار میں سے ہے۔ جملہ فضائل و خصال عالی کا مجموعہ سرِ اُپا معدنِ کمال جمال۔ شریعت و طریقت کے امتزاج کا دل آویز نمونہ۔ تقویٰ و طہارت میں یکتا، عجاہرے اور استقامت میں تنہا۔ صبر و قناعت اُن کا جوہر، ریاضت و عبادت اُن کا زیور۔ اُن کے تجربہ علمی اور وسعتِ نظر کی ایک عالم پر دھاک بیٹھی ہوئی، معقولات و منقولات کے اُستاد بے بدل۔ وجاہتِ صوری سے آراستہ، ہیبتِ معنوی سے پیراستہ، اُن کے اخلاق کریمانہ، اُن کے اشفاق حکیمانہ، عجم کے حسین طبیعت عرب کے سوزِ دروں کی تصویر۔ اس تمام حسنِ کمال اور علمی جاہ و جلال کے باوجود اپنے آپ کو فنا کیے ہوئے

ٹٹائے ہوئے۔ اپنی ذات کی نفی کرنے کا فن حمید احمد خان نے مولانا ہی سے سیکھا تھا۔

مولانا شبلی کے چہیتے شاگرد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کے جاں نثار عاشق اور مرید سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر حسن گیلانی رحمہم اللہ تعالیٰ کے جگڑی دوست مولانا عبدالماجد دریادہ ان کی اور یہ ان کی خلوت و جلوت کے آشنا و راز دار مولانا تذکون عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں فلسفہ اور دینیات کے استاد رہے۔ آج کل ضعیف پیری کے ہاتھوں مجبور ہیں اور لکھنؤ میں قیام ہے۔ تاہم اس عمر میں بھی جب کہ طرح طرح کے عواض نے مستقلاً گھیر رکھا ہے۔ کچھ نہ کچھ کام تصنیف و تالیف کا کیے جاتے ہیں۔ معلم ہیں اور اپنے مقدس فرائض کا حق ادا کرنا جانتے ہیں۔ حال ہی میں آپ کی دونی کتابیں شایع ہوئی ہیں۔ پہلی ”مذہب اویسا ٹس“ دوسری ”کلامیات قرآن“

بہت برس ہوئے مولانا اپنے خلف الرشید شمس الباری صاحب کی تقریب شادی میں یا شاید اس کے کچھ عرصے بعد پاکستان تشریف لائے تھے اور لاہور میں چند روز قیام فرمایا تھا۔ انہی دنوں چند محلوں کے لیے حضرت مولانا کی زیارت کا اتفاق خوش نصیبی سے رات کو ہوا۔ اب صحیح یاد نہیں آتا کہ کہاں؟ شاید جامعہ اشرفیہ میں یا حضرت مولانا فضل قدیر ظفر ندوی مدظلہ العالی کے دولت کدے ظفر علی روڈ پر۔ اب تک نظارہ جمال سے آنکھیں روشن ہیں ع

افسوس تم کو میرے صحبت نہیں ہی

حمید احمد خان کے طالع کی فیروز مندی اور بخت کی ارجندی دیکھیے کہ انھیں استاد الکل حضرت مولانا عبدالباری کی خدمت میں پہنچا دیا۔ مولانا نے جوہر قابل دیکھا۔ پرکھا اور عزت گرد پر علم کے سوتے کھول دیے محبت اور شفقت کا دریا جیسے رواں بہا گیا۔ ادھر شاگرد بھی ایسے ہی استاد کی تلاش میں تھا اس کے دل میں بھی علم کی جینٹک تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہچان لیا۔

گر نسوز و شمع کے پروانہ شیدائی شود

۱۹۶۷ء میں حمید احمد خان مرحوم سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور انھوں نے جس احترام و محبت سے اپنے استاد کا ذکر کیا۔ وہ انداز سخن مجھے نہیں بھولتا۔ میرا خیال تھا کہ حمید احمد خان یورپ میں رہے ہیں، انگریز استادوں سے پڑھا ہے انگریزی کے پروفیسر ہیں بے داغ انگریزی بولتے اور لکھتے ہیں۔ پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ انھیں بھلا اسلامی تہذیب و ثقافت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اپنے دور افتادہ استاد مولانا عبدالباری کہاں یاد رہے ہوں گے اور اگر یاد ہوں گے بھی تو انھیں اپنا استاد کہتے ہوئے شرمائیں گے۔ بلکہ صریحاً انکار کر دیں گے کہ جدید زمانے کے سیل رواں نے ان تمام قدیم مشرقی اقدار کو خس و خاشاک بنا کر بہا دیا ہے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب حمید احمد خان نے نہ صرف بڑے فخر سے مولانا عبدالباری ندوی کی شاگردی کا اعتراف کیا، بلکہ انھیں یاد کر کے آب دیدہ ہو گئے۔ دیر تک یہی کیفیت رہی جیسے ان کے ذہن میں پرانی صحبتوں اور یادوں کے قالوس روشن ہو گئے ہوں کہنے لگے۔

”مولانا کی شاگردی کی دولت مجھے نصیب نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں کھٹک کر کہیں کا کہیں جا نکلتا۔ میں نے بقدر ظرف ان سے بہت کچھ پایا، وہ تو سمندر تھے۔ اب وہ بھارت میں ہیں، میں یہاں پاکستان میں۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے قریب ہی ہیں۔ کاش، وہ جسمانی طور پر بھی کسی صورت یہاں آ سکتے۔ پاکستان کو ایسا سائبر (باقی صفحہ ۱۶۲ پر)

اسرار زیدی

اک چراغ اور بجھا

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

ندیم صاحب کا یہ شعر اپنے دامن میں جو تلخ حقیقتیں سیٹے ہوئے ہے۔ ان کا بھلا کون منکر ہو سکے گا۔ لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر المیہ یہ ہے کہ اعزاز کے ساتھ دفن کی توفیق بھی کتنے لوگ ہیں جنہیں میسر آتی ہے۔ ہمارے ادیب اور دانشور ناقدری بنائے وطن کا گلہ اپنے سینوں میں دبائے ایک ایک کر کے اٹھتے جاتے ہیں۔ بے شک موت تو ایک اہل حقیقت ہے۔ ایک نہ ایک دن مرنا تو بھی کو ہے۔ لیکن تمام تر کاوشوں جدوجہد اور قربانیوں کے عوض اگر سکون اور فرحت کے چند لمحے بھی میسر آجائیں تو کم از کم مرنے والے کے پس ماندگان کے دکھوں میں قدر سے کمی واقع ہو جاتی ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کی موت اہل لاہور ہی نہیں پورے پاکستان کے لیے الم انگیز اور لرزہ خیز ہے، اُن جیسے صاحب بصیرت لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے، ظاہر ہے اُن کی موت سے پیدا ہونے والا خلا مشکل سے ہی پُر ہو سکے گا۔

پروفیسر مرحوم کی شخصیت گونا گوں خصوصیات کی حامل تھی وہ ایک متبحر عالم بلند پایہ محقق، صاحب طرز انشا پرداز اور ملک کے ممتاز ماہر تعلیم تھے جنہوں نے اپنی تمام عمر علم و ادب کے فروغ کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان کی زندگی کا سب سے وسیع اور قابل قدر علمی و تحقیقی کارنامہ دیوان غالب کا نسخہ، حمیدیہ ہے، جو انھوں نے کئی سال کی جگر کاوی کے بعد از سر نو مرتب کر کے شایع کرایا۔ ان دنوں کچھ عرصے سے وہ غالب پر انگریزی اور اردو میں دو کتابیں تحریر کر رہے تھے جو ان کی اچانک موت کے باعث نامکمل رہ گئیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں کی موت کی خبر سے لاہور کے علمی و ادبی حلقوں میں کہرام مچ گیا۔ اپنی جملہ خصوصیات اور مرجان مریخ طبع کے سبب وہ ہر حلقے میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ چنانچہ ان کی موت کے تیسرے روز حلقہ ارباب ذوق کے دولوں گروپ (سیاسی و ادبی) کی طرف سے اتوار کی شام کو تعزیتی اجلاس منعقد ہوئے حلقہ ارباب ذوق (سیاسی) میں صدارت کے فرائض ممتاز مصور ”صادقین“ نے انجام دیئے مقررین میں حسین نقی، تبسم کاشمیری، مسعود اللہ خاں، ایرگ سپین کے نام قابل ذکر ہیں چاروں حضرات نے پروفیسر حمید احمد خاں کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی موت سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ مشکل سے ہی پُر ہو سکے گا۔ پروفیسر تبسم کاشمیری نے اپنے مضمون میں مرحوم کی صلاحیت کا ذکر کیا جو اس میں بحیثیت استاد موجود تھی۔ انھوں نے کہا کہ علم و دست کی حیثیت

سے تو اُن کو زمانہ جانتا ہے۔ لیکن اُن کی ایک نغفی خصوصیت سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے ایک ہم جماعت طالب علم کا واقعہ پیش کیا جو بے حد غریب تھا۔ فیس تو کیا اس کو دو دقت کی صبح خوراک بھی میسر نہ تھی۔ اس کے ان حالات کا علم پروفیسر حمید احمد خاں کو کسی طرح ہو گیا۔ چنانچہ کلاس لینے سے قبل پہلے اُسے اپنے دفتر میں بلا کر کھانا کھلا دیتے پھر اپنے تدریسی مشاغل کی جانب توجہ دیتے۔ لطف یہ ہے کہ اس صورت حال کا علم ایک عرصے تک کسی کو بھی نہ ہوا۔

پروفیسر انجم رومانی کی زیر صدارت حلقہٴ اربابِ ذوق (ادبی) کے تعزینی اجلاس میں یونس جاوید اور ڈاکٹر وزیر آغا نے مضامین پڑھے۔ پروفیسر عبادت بریلوی، انظار حسین، اور شہرت بخاری نے گفتگو کے دوران پروفیسر مرحوم سے وابستہ یادوں کا ذکر کیا۔ یونس جاوید نے اپنے مضمون میں بتایا کہ مرحوم اردو سے بے پناہ لگاؤ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی لفظ کا غلط تلفظ بھی گوارا نہ کرتے تھے انھوں نے کہا کہ بہت کم لوگوں نے ان کو پنجابی میں بات چیت کرتے سنا ہوگا۔ لیکن اپنے دفتر کے ایک صاحب سے وہ ہمیشہ پنجابی میں گفتگو کرتے تھے۔ یہ صاحب عام طور پر مرزا کو حجاز بولا کرتے تھے پروفیسر مرحوم نے ان کی تصحیح کرنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن وہ درست تلفظ نہ ادا کر سکے۔ اس پر پروفیسر مرحوم نے ہمیشہ اُن سے پنجابی زبان میں بات چیت کی۔ یونس جاوید کا کہنا تھا مرحوم خطوں کے جواب سب سے زیادہ اہتمام سے لکھوایا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ دفتر میں بھی خطوط کی قائل بالکل علیحدہ تھی۔ وعدہ بخاں نے میں شاید ان کا کوئی نمٹانی نہ تھا اس کے علاوہ اہم معاملات میں عام طور پر پروفیسر وقار عظیم سے مشورہ کرتے تھے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے مضمون میں ان یادوں کا تذکرہ تھا جو پروفیسر مرحوم سے متعلق تھیں۔ مرحوم سے ان کا تعارف ۱۹۵۹ء میں ہوا پہلی ہی ملاقات میں یہ تاثر ملا کہ وہ ادب ہی نہیں زندگی کے ہر شعبے میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ غالب کے اس شعر کے قائل نہ تھے کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچاننا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس کے برعکس انھوں نے جب کسی راہرو کا ساتھ دیا تو اسے زندگی بھر کا ساتھی سمجھا۔ لکھنے والوں کے لیے ان کا مشورہ ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ موضوع کو گرفت میں لیے بغیر اس سے انصاف نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنی تحریروں اور گفتگو تک میں الفاظ کا استعمال نمود و نمائش کے لیے کبھی نہ کرتے۔ مزید برآں ان کو خود پر ہادی بھی نہ ہونے دیتے الفاظ کے ساتھ ان کا سلوک سچ پوچھیے تو استاد شاگرد کا سا تھا۔ انھوں نے ذہنی واردات کو توڑ موڑ کر پیش کرنے کی بجائے حقیقی اور سیدھے سادے انداز میں پیش کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ بھی انکشاف کیا کہ پروفیسر مرحوم اور مولانا صلاح الدین دولوں کو روماتیات سے بھی بڑا لگاؤ رہا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنی تقریر میں پروفیسر حمید احمد خاں کی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے زندگی میں بے شمار لوگ دیکھے ہیں۔ لیکن پروفیسر مرحوم جیسی عظمت کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی میں بہت سے قابل اور باصلاحیت دانش چانسٹر ہو گزرے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس یونیورسٹی کو حمید احمد خاں جیسا عظیم دانش چانسٹر کبھی نہ ملا۔ انھوں نے سرکاری فائٹوں میں بھی جو کچھ لکھا وہ فی الواقع ادب کا ایک حصہ تھا جب یونیورسٹی

میں انھوں نے اپنا عہدہ سنبھالا تو اس وقت تک تمام کام انگریزی زبان میں انجام پاتا تھا اور اردو کا یہاں کوئی مقام نہ تھا لیکن محکمہ تعلیم کے اعلیٰ افسروں کی مخالفت کے باوجود انھوں نے یونیورسٹی کا تمام کام اردو میں شروع کر دیا وہ بڑے پہلو دار فکرے لکھا کرتے ایک ایک لفظ کو بڑی احتیاط سے پرکھتے پھر احاطہ تحریر میں لاتے۔ پروفیسر مرحوم نے یونیورسٹی میں غالب اور اقبال پر جو کام کیا۔ وہ محققین کے لیے مشعل راہ ثابت ہو گا۔ وہ بظاہر بڑے سخت کوشش لیکن انتہائی معتدل شخصیت کے مالک تھے۔ اکثر صاحب نے بتایا کہ وہ کسی دعوت میں جاتے تو صاحب خانہ سے کہہ کر اپنے شو فر کو پہلے کھانا کھلواتے ایک بار سرکاری دورے پر ترکی گئے تو وہاں کھانے کی میز پر ان کے ہمراہ وہ شو فر بھی تھا جو حکومت ترکیہ کی جانب سے ان کی خدمت کے لیے مامور تھا، اس واقعہ کا ان پر بہت اثر ہوا۔ چنانچہ دوستوں کی مجلس میں اکثر کہا کرتے۔ کہ جب ترکی تہذیب میں شو فر کو اتنی اہمیت حاصل ہے تو یہاں پاکستان میں کیوں نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پروفیسر مرحوم انتہائی لمبھنتی تھے وہ ہمیشہ مصروف رہتے۔ طبیعت میں وفاداری کا یہ عالم تھا کہ بے پناہ مصروفیت کے باوجود ذاتی خطوط ہمیشہ اپنے ہاتھ سے لکھتے۔ ان کے خطوط بھی ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تمام زندگی ہمہ گیر اور کھلی کتاب کی مانند تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بڑے عظیم شخص تھے۔

انتظار حسین نے اپنی تقریر میں بتایا کہ خان صاحب جب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو مجھے یقین تھا کہ یونیورسٹی اب صحیح معنوں میں ایک علمی ادارہ بن جائے گی۔ چنانچہ بعد میں میرا یہ خیال بڑی حد تک درست ثابت ہوا انھوں نے دو کام تو ایسے کیے جن کی بنیاد پر ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ پہلا کام تو مرزا غالب کی صد سالہ برسی پر ان کی تمام تصنیفات کی اشاعت تھا۔ انتظار حسین نے انکشاف کیا کہ خان صاحب کے اس پروگرام سے افسران بالا خوش نہ تھے وہ اس مسئلے کو خواہ مخواہ سیاسی رنگ دے رہے تھے۔ لیکن پروفیسر مرحوم نے استقلال کا دامن تھامے رکھا اور تمام مخالفتوں کے باوجود صاحب علم افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جس کی سرکردگی میں غالب کی تمام تصانیف بڑی محنت کے ساتھ ترتیب کر کے شایع کی گئیں۔

خان صاحب کو مسلمانوں کی تہذیب کے ساتھ بڑا لگاؤ تھا وہ پاکستان اور اردو کے زبردست حامی تھے چنانچہ دوسرا اہم کام انھوں نے یہ کیا کہ پاکستانی تہذیب کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے محققین کا ایک ادارہ قائم کیا، یہ ایک ایسا علمی ادارہ تھا جس کا ہماری پوری تہذیب سے ایک رشتہ بنا۔ لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ خان صاحب کے بعد یونیورسٹی پھر اپنی پرانی سطح پر آگئی۔

انجم رومانی نے اپنی صدارتی تقریر میں انکشاف کیا کہ پروفیسر مرحوم نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن سے حساب میں بی۔ اے کیا۔ ان کی حیثیت ایک چٹان کی سی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں کوئی بھی نہ خرید سکا۔ ہر شخص کے لیے ان کے پاس محبت اور کلمہ خیر کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کمی ایک عرصے تک محسوس ہوتی رہے گی۔

افکار کے خاص ایڈیٹر / سجاد ظہیر ایڈیٹر - مصلحہ زیدی ایڈیٹر

زاہد نازانی

اکٹ آزاد مَرْد

پروفیسر حمید احمد خاں

پروفیسر حمید احمد خاں ہم سے رخصت ہو گئے اور اپنی حسین یادوں کے قافلے چھوڑ گئے۔ وہ صحیح معنوں میں اپنی ذات میں ایک انجمن اور اپنی شخصیت میں ایک ادارہ تھے۔ اپنے مدد و روح غالب کے لفظوں میں وہ ایک "مختصر خیال" تھے وہ خاندانہ شخصیات کے اس دور میں ایک ہمہ گیر انسان تھے۔ ادیب، ماہر تعلیم، منتظم اور محقق، پچھلی صدی سے ہمارے ہاں ہمہ گیر انسانوں کی جو روایت شروع ہوئی تھی۔ شاید خاں صاحب اس کے آخری آدمی تھے۔

ان کی شخصیت کی بڑائی کا راز ان کی وسعت علم، وسعت منہرب اور وسعت قلب میں مضمر تھا، ان کی وسعت علم کا یہ حال تھا کہ انھیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں عبور تھا۔ ورثہ و رتھ سے لے کر غالب تک کے بارے میں ان کی رائے ایک مسند کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ ایک محرر کا کلاس روم ٹیچر بھی تھے۔ اور ایک ٹائیڈ بھی۔ یہ وہ اوصاف ہیں۔ جو کسی استاد میں شاذ و نادر ہی جمع ہوتے ہیں۔ ادب کے بڑے اساتذہ کی طرح وہ ادب میں عملی طور پر بھی شامل تھے۔ اور اس لحاظ سے شبلی، محمد حسین آزاد، تاثیر اور بطرس کی روایت کے امین تھے۔ اقبال اور غالب سے ان کی وابستہ اور غریب کی وابستگی کے معلوم نہیں۔

علم و فضل کے ساتھ ساتھ انھیں انتظامی امور میں بھی بے حد مہارت حاصل تھی۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ ان تمام عہدوں پر فائز ہوئے۔ جن پر ایک استاد فائز ہو سکتا ہے۔ اسلامیہ کالج میں ان کی پہلی کال زمانہ اسلامیہ کالج کا سنہ ہی زمانہ تھا۔ ان کے زمانے میں تھروڈا بیر سے لے کر ایم۔ اے تک کے امتحانوں میں اسلامیہ کالج کے طالب علموں کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ خاں صاحب کی وسیع قلبی اور علم دوستی کی بدولت ہر نظریے اور ہر خیال کے بہترین اساتذہ اسلامیہ کالج میں جمع تھے۔ ماحول علمی اور پاکیزہ تھا۔ اور اسلامیہ کالج کی چار دیواری اساتذہ کی "سیاست" سے نا آشنا تھی۔ پروفیسر ایرک سپرین سے ابو بکر غزالی تک سب اساتذہ ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔ اور اپنے خونِ جگر سے علم و ادب کی اس روایت کی آبیاری کر رہے تھے۔ جس کا نام اسلامیہ کالج تھا اور جس کی علامت پروفیسر حمید احمد خاں تھے خاں صاحب کی مثال ایک برگد کی تھی جس کے سائے میں بیٹھ کر استاد اور طالب علم، دونوں علم و ادب کی معرفت حاصل کرتے تھے۔

پروفیسر حمید احمد خاں کے زمانے کا ایک اور امتیازی وصف یہ بھی تھا کہ طلبہ میں علمی، ادبی اور تخلیقی سرگرمیاں اپنے عروج پر

تھیں۔ مشاعرہ شمع تاثیر اور بزم فروغ اردو کے جلسے نوجوان ادیبوں کی تربیت گاہ تھے۔ نوجوان ادیبوں کی مشہور تنظیم بنگ رائٹرز بھی خان صاحب کے زمانے ہی میں قائم ہوئی۔ اسی زمانے میں منیر نیازی نے "نصرت" میں کالم لکھتے ہوئے کہا تھا کہ اردو ادب گورنمنٹ کالج سے نکل کر ادھر کچہری کا گول چکر پار کر کے اسلامیہ کالج میں داخل ہو گیا ہے۔ خان صاحب کی پرنسپل کے زمانے کے طالب علم آج علم و ادب، صحافت، تعلیم و تدریس اور زندگی کے دوسرے اہم شعبوں میں نام پیدا کر چکے ہیں۔

پروفیسر حمید احمد خان کی وسیع اقلیتی کا یہ حال تھا کہ وہ ان تمام لوگوں کو گلے لگا لیتے اور ان کی قدر کرتے، جو بے شک ان کے ہم خیال تو نہ تھے، لیکن اپنی قابلیت اور اہلیت کی بنا پر قابل عزت اور قابل قدر تھے۔ خان صاحب مرحوم اپنے سیاسی نظریے کے لحاظ سے کٹر قسم کے پرانے مسلم لیگی تھے۔ لیکن جب اسلامیہ کالج و حصوں میں منقسم ہوا، اردوہ مدلل لائٹرز کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تو انھوں نے اپنے کالج کے لیے پروفیسر ایمرک سپرین کا انتخاب کیا۔ اسی طرح پروفیسر امین مغل کا تقریبی خان صاحب ہی کے زمانے میں ہوا۔ اس سلسلے میں ایک اور قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ جب فیض احمد فیض آخری مرتبہ گرفتار ہوئے، تو ادیبوں کے جس وفد نے فیض صاحب کی رہائی کے لیے جدوجہد کی، اور اباب اقتدار سے رابطہ قائم کیا۔ اس وفد کے سربراہ بھی پروفیسر حمید احمد خان ہی تھے۔ یہ بھی خان صاحب کا حصہ تھا کہ انھوں نے اسلامیہ کالج کی تقریبات میں جہاں خفیض جالندھری کو بلوایا، وہاں فیض احمد فیض اور دیوندر ستیا رتھی کو بھی مدعو کیا۔ مرحوم میں تعصب نام کو نہیں تھا۔ وہ غالب کے لفظوں میں ایک "آزاد مرد" تھے۔ ان کا عقیدہ انسان دوستی اور ان کا نظریہ انسانی عظمت کا احترام تھا۔

پروفیسر صاحب ایک بہت بڑے قوم پرست تھے۔ ان کی پسند اور ناپسند کا تعین صرف اپنے ملک، اپنی قوم اور تہذیب کی محبت کے حوالے سے ہوتا تھا۔ اردو زبان سے ان کی محبت کا سبب بھی یہی تھا۔ وہ اردو کو پاکستانی قومیت کی علامت سمجھتے تھے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ مرحوم انگریزی زبان کے بہت بڑے فاضل اور جلیل القدر استاد تھے۔ وہ انگریزی ادبیات میں کیمرج یونیورسٹی کے فاضل تھے۔ اور سا لہا سال تک ایم۔ اے انگریزی کی کلاسوں کو پڑھاتے رہے۔ لیکن انھوں نے تن من اور دھن سے اردو زبان کی خدمت کی۔ وہ اردو کے جان نثار سپاہی تھے۔ جب تک جیسے اردو کی عظمت کی بحالی کے لیے لڑتے رہے۔ انھوں نے اسلامیہ کالج کی بزم فروغ اردو سے لے کر بابائے اردو کا نفرنس تک ہر جگہ اردو زبان و ادب کی ترقی، فروغ اور سر بلندی کے لیے عملی جدوجہد کی۔ مجھے یاد ہے جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو ایک مرتبہ ترکی کے کچھ پروفیسر حضرات یونیورسٹی آئے۔ ان کے استقبال کے لیے ایک تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت خان صاحب نے فرمائی۔ جب خان صاحب کی باری آئی تو انھوں نے کہا، مجھے افسوس ہے کہ ترکی زبان نہ جاننے کی وجہ سے میں اپنے مہمانوں کے سامنے ایسی زبان میں تقریر کرنے پر مجبور ہوں، جسے ہماری قوم کب کا رد کر چکی ہے۔ اسی طرح بی۔ اے اور بی۔ ایس۔ سی اور ایم۔ اے کے امتحانات میں اردو کا ذریعہ اظہار بنایا جاتا اور یونیورسٹی کی ڈگری کا اردو میں طبع ہونا پروفیسر صاحب کی اردو پرستی کی جیتی جاگتی یادگار ہیں۔ ان کی اردو پرستی یہیں تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ اردو ادب کے ایک مجتہد نقاد اور محقق بھی تھے۔ غالب کے بارے میں ان کی تحقیق اور اقبال کے بارے میں ان کے مضامین، پھر اردو غزل کے بارے میں ان کا مضمون پوری دنیاے اردو میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ خان صاحب ایسے ادیب تھے، جن کا بلند ادبی مرتبہ ان کی تحریروں کی مقدار سے نہیں بلکہ معیار سے متعین ہوتا ہے۔ ان کے اندر ایک بہت بڑا ادیب چھپا ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنی ملازمت کی مہر و فیات

کی وجہ سے اپنی بے پناہ ادبی صلاحیت سے پوری طرح انصاف نہ کر سکے۔ وہ اپنے دوستوں سے اکثر کہا کرتے تھے۔ ”میری ملازمت میری موت“ ہے۔ پروفیسر صاحب غالب کے بشیر الہی تھے۔ ان کی غالب پرستی کا سلسلہ بنی ماران سے لے کر مجلس ترقی ادب تک پھیلا ہوا تھا۔ غالب کی صد سالہ برسی منانے کی تحریک اور اس تحریک کو سرکاری سطح پر تسلیم کرنا اس سلسلے میں ان کا تازہ ترین اور آخری کارنامہ تھا۔ وہ اقبالیات کے بھی بلند پایہ عالم تھے۔ اقبال کی شاعری پر انگریزی شاعروں کے اثرات کے بارے میں ان کا مقالہ اس موضوع پر سب سے پہلا اور اہم ترین مقالہ تھا۔ اور یہ مقالہ انھوں نے سب سے پہلے حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں پڑھا تھا۔ حلقہ سے ان کی وابستگی بہت پرانی تھی۔ ساہا سال تک وہ حلقے کے ہفت روزہ جلسوں میں باقاعدگی سے شریک رہے اور اہل حلقہ کو اپنے مضامین سے فیض یاب کرتے رہے۔ اگرچہ بعد میں ان کی کٹینہ ورنہ مصروفیات کی وجہ سے یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری نہ رہ سکا۔ لیکن حلقے کے سالانہ جلسوں میں وہ کم و بیش باقاعدگی سے آتے رہے اور انھوں نے کئی ایک جلسوں کی صدارت بھی فرمائی۔

خدا نے پروفیسر حمید احمد خان کو جہاں ایک ذہن رسا عطا کیا تھا وہاں انھیں ایک حساس اور درد مند دل بھی دیا تھا۔ ان کی ہمدردیاں اور ہر بائیاں لا محدود تھیں۔ وہ اپنے شاگردوں اور طالب علموں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز جانتے تھے اور ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے تھے۔ وہ اپنے طالب علموں کی صلاحیتوں کی قدر کرتے تھے۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں ۱۹۵۱ء میں اسلام آباد کالج کا طالب علم تھا۔ اور خان صاحب اس کے پرنسپل تھے۔ بزم فروغ اردو کے سیکرٹری کی حیثیت سے مجھے خان صاحب سے قریب ہونے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں محمود نظامی کا انتقال ہوا تو کالج میگزین ”فاران“ کا ایک شمارہ ان کی یاد کے لیے وقف کیا گیا۔ اس شمارے میں سب سے زیادہ مضامین میرے تھے۔ یہ شمارہ بہت کامیاب ہوا اور تقریباً تمام مشہور اخبارات اور رسائل نے اپنے تبصروں میں اس شمارے کی بہت تعریف کی۔ خان صاحب میری کارکردگی سے بہت خوش ہوئے اور مجھے بہت شاباش دی۔ اس کے بعد میں ان سے قریب تر ہوتا گیا۔ مجھے اس زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ یاد ہے۔ دوسرے کالجوں کی طرح اسلام آباد کالج میں بھی کھلاڑیوں کو فیس معافی کی رعایت دینے کا دستور تھا۔ مجھے سمجھے بٹھائے کیا سوچھی کھانا صاحب کے پاس حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ اس رعایت کو صرف کھلاڑیوں تک محدود نہ رکھا جائے۔ بلکہ ادیب طالب علموں کو بھی یہ رعایت دی جائے۔ سینئر طالب علموں نے میری اس تجویز کا مذاق اڑایا اور کہا کہ یہ تجویز پیش نہ کرنا کیونکہ جو تبدیلی تم چاہتے ہو وہ کسی کالج میں بھی رائج نہیں ہے۔ میں نے اپنی رائے تبدیل نہ کی اور اس مضمون کی ایک درخواست لے کر پرنسپل صاحب کے پاس حاضر ہو گیا۔ میرے دوستوں کی توقعات کے خلاف یہ درخواست منظور ہو گئی اور خان صاحب کی ادب دوستی نے ایک نئی روایت قائم کر دی۔ خان صاحب کے ساتھ میری نیا زمندی کا سلسلہ زمانہ طالب علمی سے لے کر ان کی وفات تک قائم رہا۔ بلکہ پھٹنا پھولتا گیا۔ لیکن اس ”درد کے رشتے“ کی نشوونما میں صرف خان صاحب کی شفقت و محبت، مہربانی اور مہر پرستی کو دخل تھا اور میں۔ میں بی۔ اے کر کے کے بعد اپنے نامساعد حالات کی وجہ سے سلسلہ تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور اے۔ جی آفس میں ملازم ہو گیا۔ میں ابھی اے۔ جی آفس ہی میں تھا کہ خان صاحب پنجاب یونیورسٹی کے دانش چانسلر ہو گئے۔ میں نے بڑے تامل کے ساتھ انھیں مبارک باد کا خط لکھا۔ کیونکہ اپنی معمولی معاشرتی حیثیت اور ان کے اونچے عہدے کی وجہ سے مجھے یہ خدشہ تھا کہ شاید خان صاحب اس خط کا جواب بھی نہ دیں گے۔ میرے اس خدشے کو شکست

ہوئی اور خاں صاحب نے اسی پیار اور انس کے ساتھ مجھے شکرے کا خط لکھا جس کے وہ پیکر تھے۔ یہ بھی ان کی وائس چانسری کے زمانے کا ذکر ہے کہ میں نے درجہ دوم کی ایک ملازمت کی درخواست دی ملازمت کا یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا، حسب معمول خاں صاحب کے پاس حاضر ہوا۔ خاں صاحب آج کل کے اکثر بزرگوں کی طرح مال مٹول اور بخل کے عادی نہ تھے۔ ان کی دوستی اٹل تھی۔ ان کا دل دریا تھا۔ اور ان کا خلوص بروجہ۔ وہ ہر قیمت پر اپنے دوستوں اور شاگردوں کی مدد کرنا جانتے تھے۔ توقع کے مطابق میرا کام ہو گیا۔ میں شکر یہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ انھوں نے ایسی بے نیازی کا انہما کیا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

کہنے لگے۔ ”بھائی انسان اپنی زندگی میں کسی تیر بھینکتا ہے۔ کبھی کوئی نشانے پر بھی لگ جاتا ہے۔“
خاں صاحب نے اپنی وائس چانسری پر کبھی فخر نہیں کیا۔ البتہ انھیں اپنے استاد اور ادیب ہونے پر ناز تھا۔ وہ استادوں اور ادیبوں میں اس انس اور اپنائیت کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جیسے اپنے اہل خانہ کے درمیان بیٹھے ہوں۔ وہ ان صاحب اقتدار لوگوں کے بالکل برعکس تھے۔ جو ادبی محفلوں میں بیٹھ کر تو ادیبوں کے فن پاروں کی داد دیتے ہیں۔ لیکن جب کبھی زندگی میں کسی ادیب کو ان کی مدد کی ضرورت ہو تو آنکھیں چرائیتے ہیں۔ خاں صاحب ہر ادیب کا احترام کرتے تھے۔ خواہ وہ کوئی منیئر ادیب ہو یا نو عمر، ان کا ملنے والا ہوا اجنبی۔ وہ اپنے شاگردوں اور دوستوں کی عزت ان کے معاشرتی مرتبے کے حوالے سے نہیں بلکہ ان کی علمی اور ادبی خدمات کی بنا پر کرتے تھے۔ جس زمانے میں میں حلقہ ارباب ذوق کا جوائنٹ سیکریٹری تھا تو مرحوم جب کبھی حلقے کے جلسے میں تشریف لاتے مجھے وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ اپنی وائس چانسری کے زمانے میں بھی وہ حلقے کے سالانہ جلسے میں آتے اور جلسے کے بعد پاک ٹی ٹی وائس کی محفل میں بڑی بے تکلفی کے ساتھ شریک ہوتے۔ مجھ پر ان کی شفقت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ جس محفل میں ملتے۔ مجھے اپنا دوست کہہ کر متعارف کراتے۔ مجھے خیر ہے کہ ان کا آخری ادبی انٹرویو میں نے لیا اور وہ ماہ لڑیں شایع ہوا۔

چند ماہ پہلے میں خاں صاحب سے ملنے مجلس ترقی ادب کے دفتر گیا، تو انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی ادبی تحریروں کو یک جا کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں ماہ نو کے اس پرچے کی ضرورت ہے۔ اگلے روز میں نے وہ پرچہ پیش کر دیا۔ اس سے اگلے روز میں شام کو مزنگ روڈ پر اپنے دفتر کے برآمدے میں داخل ہو رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پروفیسر حمید احمد خان اپنے چھوٹے صاحبزادے کے ساتھ جا رہے ہیں۔ ان کی پشت میری طرف تھی۔ میں بھاگ کر ان کے پاس پہنچا۔ پوچھا کہ کدھر سے تشریف لا رہے ہیں۔ فرمائے لگے تمھاری طرف ہی آیا تھا۔ لیکن تمھارا دفتر نہیں ملا۔ میں نے معذرت کی اور آمرا کا مقصد پوچھا۔ فرمائے لگے کل تم میری میز پر ایک کاغذ بھول آئے تھے۔ جو کوئی دفتر کاغذ معلوم ہوتا ہے، میں نے سوچا، خدا جانے تمھیں اس کی کتنی ضرورت ہو۔ اس لیے تمھیں پہنچانے کے لیے چلا آیا۔ ان کی یہ بات سن کر میری آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

پروفیسر حمید احمد خاں مجھ سے اور اپنے دوسرے بے شمار عقیدت مندوں سے جدا ہو چکے ہیں، ان کی جدائی نے دلوں کے جوگوں شے دیران کر دیے ہیں انھیں کوئی دوسرا آباد نہیں کر سکتا۔

تھی جو اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائی خیال کہاں

یونس جاوید

دوسرا دن

یہ ۳۲ مارچ ۱۹۷۷ء کا دن ہے گرد آلود ہواؤں نے ادک بھر مٹی ہر سریش ڈال دی ہے اور بہاول پور روڈ کی عید گاہ میں سروں کا سمندر ہے۔

ابھی ابھی یہاں ایک جنازہ پڑھا جا چکا ہے، میت، قبر میں ہمیشہ کے لیے اوجھل ہونے کے لیے روا نہ ہو گئی ہے۔ عید گاہ کے آس پاس لوگ ٹکڑیوں میں بٹے پڑھے میڑھے دائروں میں کھڑے ہیں۔ دنیا بھر کے موضوعات زیر بحث ہیں۔ ہاں پتے سانسوں سے موضوعات پر سے جلد جلد پھسلتے ہوئے ان میں کچھ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا:

”اب مجلس میں کون آ رہا ہے؟“ — اس شخص کی میت ابھی دفن نہیں ہوئی جس نے دوستوں کے جنازوں کو کندھے بھی دیئے تھے، دفن بھی کیا تھا اور پھر ورثا کے غم میں ہمیشہ کے لیے شریک ہو گیا تھا۔

ایک نے پوچھا: ”اب مجلس ترقی ادب میں کون ڈائریکٹر ہو گا؟“

”ابھی کچھ پتہ نہیں“

”..... صاحب تو نہیں آ رہے؟“

”شاید!“

”خدا کے لیے کچھ کر دو۔ اسے روکو۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔“

”پہلے سرگوشی ہوتی ہے۔ پھر تہقہہ لگایا جاتا ہے اور ایک کہتا ہے۔“

”آپ قبرستان تک میت کے ساتھ نہیں جائیں گے؟“

”نہیں۔ دوسرا شخص کہتا ہے۔ سب لوگ مجھے یہیں مل گئے تھے۔“

”لحم بھر توقف کے بعد تیسرا پوچھتا ہے۔“

”خیف رائے صاحب آئے تھے؟“

”جی ہاں۔ صبح گھر آئے تھے۔“

ایک شخص چاروں طرف گھومتا ہوا کہتا ہے: ”ابھی ابھی کا ردار صاحب کو میں نے جنازے کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔“

دوسرا کہتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق بھی یہیں تھے۔ ارے۔ انھوں نے ایک طرف گھورتے ہوئے جیسے اپنے

آپ سے پوچھا۔ یہ اجل صاحب تو نہیں؟ یہ کب آئے؟ اور پھر ڈاکٹر اجمل صاحب کے پیچھے لپک گئے۔ یہ سب لوگ مرے والے کے دوست تھے۔ اور بظاہر سنگ دل نہ تھے، اور ابھی ابھی جس شخص کا جنازہ پڑھ کر میت کو قبر کی طرف لے جایا گیا تھا وہ حمید احمد خاں تھے معاف کیجیے۔ پروفیسر حمید احمد خاں۔ جن کی زندگی میں مجھے کبھی یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ میں ان کا نام پروفیسر کے لفظ کے بغیر لکھوں۔ یا بولوں۔ مگر اب میرے علاوہ دوسرے لوگ بھی تو ان کے نام کے اس حصے کو حذف کر رہے تھے۔

مجھے یاد ہے۔ پہلی مرتبہ جب میں نے انھیں اس لفظ کے بغیر لکھا تھا۔ تو انھوں نے کہا تھا۔ ”بھائی۔ جو چار دن میں نے پڑھانے میں صرف کیے ہیں۔ اس کا نشان تو رہنے دو!“

جب ان کا تقریر مجلس ترقی ادب میں ہوا، وہ ملک سے باہر تھے اور یہ تقریر ان کی عدم موجودگی ہی میں عمل میں آیا تھا۔ واپس آئے۔ پہلے روز اسٹاف میننگ بائی۔ تاج صاحب والی کرسی اٹھوائی، دوسری رکھوائی۔ بیٹھنے سے پہلے کہا:۔

”جسارت ہے کہ جس جگہ کل تک میرا دوست بیٹھا کرتا تھا۔ میں بیٹھ جاؤں۔ مگر زندگی اپنی رنگوں سے عبارت ہے۔“

پھر کہا۔ دو باتیں میں آپ کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ایک تو یہ کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد میں نے جھوٹ نہیں بولا، جس کا مطلب ہے کہ جھوٹ مجھے پسند نہیں۔ دوسری یہ کہ بعض اوقات میرے لہجے کے باعث دوستوں اور رفیقوں کو مجھ سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ میرے قلم سے آپ کے خلاف کچھ نہ لکھا جائے گا۔ ایک بات اور بھی آپ کو بتانی دوں کہ جن لوگوں نے مجھ سے کبھی نہ کبھی کچھ پڑھ رکھا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ عزیز بھی ہیں۔ لیکن اگر آپ کو ان سے جائز شکایت ہوئی، تو انصاف بہر حال ہوگا۔ شاگردوں سے انھیں کس قدر پیار تھا۔ ان کے مسائل ذاتی ہوں یا گھریلو۔ خاں صاحب انھیں اتنا اہم بنا لیتے۔ جن دوران کے لیے غالب اور آقبال کا مضمون تھا، یا پھر کسی بھی شخص کا خط۔ خط کا جواب تو وہ بڑے ہی اہتمام سے دیا کرتے۔ ایک دفعہ لکھتے۔ ٹائپ ہوتا۔ غلطیاں لکھتیں۔ پھر ٹائپ ہوتا۔ رجانے والے کے خط کو ہاتھ سے لکھتے تھے، کاغذ کو بڑی احتیاط سے تہہ کرتے ہوئے لفافہ خود بند کرتے۔ پتے کو چیک کرتے اپنی ہم لگواتے تب ڈاک رجسٹر پر چڑھتی۔ ڈاک میں جانے والے خط کی شہادت اس شخص سے لیتے جو خط پوسٹ کرے گیا ہو۔ خط دستی بھجوا گیا ہو تو رسید دیکھتے۔ اور پھر ان کے چہرے پر روشنی آ جاتی۔ وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے اور خوش گوار گفتگو کرنے لگتے۔ اور میں اکثر سوچتا، یہ ایک خط کا بوجھ تھا، یا ایک پہاڑ کا۔ دوستوں، عزیزوں، شاگردوں، رفیقوں اور دفتر سے متعلق خطوط کی سیکڑوں فائلیں ایک الماری میں بند ہیں۔ وہاں ہر شخص کی فائل حروفِ ابجد کے لحاظ سے رکھی ہے۔ خطوط اور ان کے جوابات کی نقول محفوظ ہیں۔ آپ نے انھیں پنجابی بولتے ہوئے شاید نہ دیکھا ہو۔ مگر میں نے انھیں پنجابی بولتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور روتے ہوئے بھی۔

دفتر میں ایک صاحب ایسے تھے جو اردو کا تلفظ حد درجہ غلط بولتے تھے۔ خاں صاحب نے اس شخص سے کہا۔ ”تسی میرے نال پنجابی وچ گل کر لیا کرو۔“ جب وہ چلا گیا تو مجھ سے کہا۔ اردو کے ساتھ یہ سلوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ مجھ سے مزاح کے بجائے مجاز بولے۔ میں نے کوشش تو کی تھی کہ یہ صحت مندا دو سیکھ لیں، مگر اب کیا کریں ان کی مجبوری ہے۔

ڈھاکہ فال ہونے کے دوسرے روز وہ بہت سویرے دفتر آ گئے۔ چہرے پر سوالات کی زردی تھی۔ ہمیں کمرے میں بلایا۔ اور کہا اب جینے کی خواہش باقی نہیں رہی۔ پھر باتوں باتوں میں آزادی کی تحریکوں سے پاکستان کے وجود اور اس کے بعد جو بھی خواب انھوں نے دیکھے تھے ہمیں دکھائے۔ تاریخ، لفظوں کے فریم میں تصویر بن کر اچھی تھی۔ اس روز ہندوستانی جہازوں کی پروازیں لاہور پر بڑی نیچی اور پے درپے تھیں، پے درپے اتنی کہ سائرن جہاز گزر جانے کے بعد گونجتا، اور نیچی اس قدر کہ بعض اوقات گمان ہوتا کہ وہ ہمارے دفتر سے ملحقہ ہوٹل انٹر کونٹیننٹل کی چھت سے ٹکرا جائیں گے۔ اتنے میں کسی نے اطلاع دی کہ ہندوستانی جہازوں نے گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر رکھی ہے جو دفتر کے آس پاس نشانات چھوڑ گئی ہے۔

خاں صاحب اٹھے۔ اور مجلس کے وسیع لان میں ٹہلنے لگے۔ دو تین مرتبہ جہاز ناقابل برداشت گڑ گڑاؤ پیدا کرتے ہوئے گزرے۔ میں نے ان سے ڈرتے ہوئے درخواست کی کہ وہ اندر آجائیں۔ تو وہ روپڑے۔ کہنے لگے۔ ”میری خواہش ہے کہ گولیوں کی بوچھاڑ میرے اوپر سے گزرے۔ یا ہم میرے پاؤں میں آکر گرے کہ میں فنا ہو جاؤں۔“

یہ سب کچھ کس کی کوتاہی سے ہوا۔ اور کون ذمہ دار نہیں ہے۔ یہ وقت بحث کا نہیں ہے۔ یہ تو مرنے کا وقت ہے۔ ایک لمحہ توقف کے بعد بولے۔ مگر یہ آپ لوگوں کے مرنے کا وقت نہیں ہے۔ آپ اندر جائیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ لفظ ایک طاقت ہے اور اس کی سطحیں اور پرتیں ہوتی ہیں۔ اگر آپ نے اسے ایک ہی معنی میں استعمال کر دیا تو پھر آپ اس طاقت کو استعمال کرنے کا ہنر بالکل نہیں جانتے۔ لفظ کا صحیح استعمال صحیح املا کے ساتھ اور تلفظ کا صحیح استعمال صحیح لہجے کے ساتھ ان کا ایمان تھا۔ اس سلسلے میں انھیں ماضی سے سند لینا پڑتی تو ضرور لیتے۔

میں نے نسبت کا لفظ یعنی ”ہ“ کے بجائے ”ا“ سے لکھا تو کہا اگر حالی اور شبلی نے الف سے لکھا ہے تو درست ہے، اور نہ سیکھ لیجیے کہ نسبتہ ہ سے ہوتا ہے۔

دوسری مرتبہ میں نے ”برصغیر“ کہا تو مجھے سمجھایا کہ تراغظم کے بعد برعظیم ہونا چاہیے۔ برصغیر تو مٹی کا ڈھیلدا بھی ہو سکتا ہے۔ (ان کا ایک مضمون ”لفظوں کا استعمال“ ان کے زیر طبع مجموعے ”تہذیب و تعلیم“ میں چھپ رہا ہے)

اگر میں یہ کہوں کہ غالب اور اقبال سے انھیں عشق تھا تو غلط نہ ہوگا۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے غالب و اقبال پر راور اس کے علاوہ بھی جو کچھ لکھا، بہت کم لکھا، مگر مستند لکھا۔ اور اس کی

وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے ہر لفظ کے پیچھے گھنٹوں کی فکر ہوتی تھی اور چند لائنوں کے پس منظر میں تو ان کی راتوں کی نیند اور دنوں کا چین گھلا ہوتا تھا۔

چندر دزپیشتر ایک صاحب اقبال کا ایک شعر انگریزی میں ترجمہ کرانے کے لیے پہنچے۔ انھوں نے بتایا کہ قرطبہ کے ٹاؤن ہال میں علامہ اقبال کی ایک تصویر آویزاں کی جا رہی ہے اس تصویر کے نیچے یہ انگریزی ترجمہ اور اس انگریزی ترجمے سے کیا ہوا فرانسیسی ترجمہ لکھنا ہوگا۔

اقبال، قرطبہ۔ دو دنوں میں کچھ اس طرح ایک جا ہوئیں کہ اپنی ہر سانس کو قیمتی اور آخری سمجھتے ہوئے بھی انھوں نے تمام مصروفیات معطل کر دیں۔ اور ایک ایک لفظ کے مختلف رنگوں کا سراغ لگانے بیٹھ گئے۔ باوجود اس کے کہ ان کا ہر لفظ سند تھا۔ انھوں نے کئی دفعہ اس شعر کو انگریزی میں ڈھالا۔ دو دن میں یہ کام مکمل ہوا تو بے پناہ خوش تھے کہا یہ کام میرے لیے چنداں مشکل تو نہ تھا۔ مگر میں چاہتا تھا کہ انگریزی ترجمہ اس قدر درست ہو کہ اسے فرانسیسی میں ترجمہ کرتے ہوئے دوسرے مترجم اس شعر کے معنی گم نہ کر دیں۔

اقبال کے عشق نے ہی انھیں مجبور کیا تو اقبال صدی کے اہتمام میں انھوں نے خصوصاً اقبال پر چار نئی کتابیں شایع کروائیں۔ اور جلسہ بھی کیا۔

جلسے کے بعد وہ حد درجہ مطمئن تھے۔ کہنے لگے۔ کل ”سب لوگ“ ایک جگہ جمع ہو کر چائے پیئیں۔ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ کرسیاں بچیں۔ چیرا سی بھی تھے۔ مائی بھی۔ مگر خاکروب نہیں تھا۔ پوچھا جلال کہاں ہے۔ بلاؤ۔ ”سب لوگوں“ سے میری مراد سب لوگ ہی ہیں۔ پھر اس کے لیے کرسی منگو کر رکھوائی اور اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔ تو بولے۔ ”تم عیسائی ہونے کی وجہ سے ہمارے ساتھ چائے پینا پسند نہ کر دو تو الگ بات ہے۔ مگر ہمیں تمہارے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے میں کوئی عار نہیں اور پھر اس جلسے کا اہتمام کرنے والوں میں تمہارا حصہ بھی اتنا ہی ہے جتنا باقی دوسروں کا۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ میں اور میرا دفتر اکثر انہی کے حوالے سے پہچانے گئے کوئی مجھ سے پوچھتا۔ کہاں کام کرتے ہو۔ میں کہتا مجلس میں! وہ سوالیہ لہجے میں کہتا، مجلس؟ میں انگریزی میں وضاحت کرتا

BOARD FOR ADVANCEMENT OF LITERATURE —

انگریزی نام سن کر اکثر لوگ یہ جانے بغیر کہ میں کہاں کام کرتا ہوں۔ چپ ہو جاتے۔ اور جب میں انھیں بتاتا کہ میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے دفتر میں کام کرتا ہوں، تو وہ کہتے۔ ”اچھا تو یوں کہونا۔“ اور خاں صاحب کا حال یہ تھا کہ کبھی کوئی تحریر لکھتے تو کلب علی خاں فائق صاحب اور مجھے بلا کر سناتے اور کہتے دیکھیے یہ جملہ یوں درست رہے گا یا ووں۔ فائق صاحب کبھی کوئی مشورہ دیتے تو وہ جملہ بدل دیتے۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ تمام عمران کی حیثیت طالب علمانہ رہی۔ سیکھنے اور جاننے کے لیے ایک اضطراب انھیں ہر وقت بے چین رکھتا تھا باوجود اس کے کہ وہ بہت جانتے تھے اور وہ سب کچھ بھی جانتے تھے جس کے سامنے ہماری معلومات کی حیثیت (خصوصاً میری) ذرے کے برابر ہے۔

ان کا عقد محض زبان اور چند لمحوں کے لیے ہوتا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس شخص کو بلاتے جس سے ابھی ابھی وہ ناراض ہو گئے تھے اور کہتے: "تشریف رکھیے"۔ اور پھر نہایت محبت اور شفقت سے بالکل اس طرح سمجھاتے جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کو سمجھاتا ہے، اس میں ان کا حکم نہ ہوتا، مشورہ بخیر اور نصیحت ہوتی۔ دوسروں کے ذاتی کاموں میں مداخلت کبھی نہ کرتے، مگر کبھی کبھی نصیحت ضرور کرتے۔ ایک مرتبہ، جب میں ایم۔ اے کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا انھوں نے مجھ سے کہا: "یولنس جاوید صاحب (اکثر انہی الفاظ سے مخاطب کرتے تھے) اور نیٹیل کا لچ کے کسی استاد کو ناراض نہ کیجیے گا۔" پھر ایک لمحہ رک کر کہا: "سیاست علم ادب سے بہت سطحی چیز ہے۔ اور یہ سطحی چیز اور نیٹیل کا لچ میں جا کر کچھ اور کبھی سطحی ہو گئی ہے۔ میں تو والٹس چانسلر بھی رہا ہوں اور وہاں کے ماحول کو جانتا ہوں۔ مگر آپ کو زیادہ فکر کی کبھی ضرورت نہیں۔ آدمی اپنی سفارش خود ہوتا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انھوں نے جو کبھی وعدہ ایک مرتبہ کر لیا پھر اسے ہر طرح نبھایا۔ یہ وعدہ اپنے آپ سے ہوتا یا کسی دوسرے سے، پھر اس سے پھر ناکم از کم ان کے لیے محال تھا۔ حتیٰ کہ کسی کو ملاقات کا وقت ۹ بجے دیا ہوتا تو ۸ بجے کر پچیس منٹ پر اس کا انتظار شروع کر دیتے۔ دفتر کو مدد لیا ت مل جاتیں، ملاقاتی کا کام اگر دفتر سے متعلق ہوتا تو اس کی آمد سے پہلے پہلے ہر فائل تیار ہوتا۔

ملاقاتی اگر صبح وقت پر آ جاتا تو وہ بہت خوش ہوتے، لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی طبیعت خراب ہونے لگتی۔ موڈ بگڑ جاتا اور بے چینی اس حد تک بڑھ جاتی کہ ہر کوئی اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھا بھی ٹوڑ رہا ہوتا تھا۔ میں نے چار پانچ برس کی مدت میں انھیں کسی کو وقت دے کر بھولتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مگر ۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو انھوں نے بہت سی وعدہ خلافیاں ایک ساتھ کر دیں۔ بہت سوں کو وقت دیا مگر بھول گئے۔

۲۲ مارچ کو انھیں عبداللہ قریشی سے ملنا تھا۔ ساڑھے نو بجے کا وقت طے ہو گیا تھا اور وہ دس بجے تک نہ آئے تھے۔ پچھلے ۵ برسوں میں میرے سامنے ان کی یہ پہلی طے شدہ ملاقات تھی جسے وہ نبھانا نہ سکے تھے۔ (یہ پہلی وعدہ خلائی تھی)۔

انتظار حسین نے "انشائی دو کہانیاں" مرتب کیں اور دیباچہ لکھا۔ خاں صاحب دیباچہ پڑھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ ایک جلسے کے دوران میں سب دوستوں کو جا جا کر دکھلایا اور ان سے کہا: "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اسے ضرور پڑھیے۔" اس حوالے سے مشرق پڑھنا شروع کر دیا۔ ہر روز خبروں کے لیے "پاکستان ٹائمز" اور "لاہور نامہ" کے لیے مشرق دیکھتے۔ اور کبھی کبھی مجھے بھی تلقین کرتے۔ ایک مرتبہ تو یہ بھی کہا کہ "ہمیں یہ بات مان لینی چاہیے کہ ہمارے درمیان ایک شخص ایسا بھی ہے جو عجیب و غریب لکھتا ہے۔"

مگر ۲۲ مارچ کو انھوں نے مشرق منگوا یا۔ اور کہا دفتر جانے سے پہلے میں لاہور نامہ پڑھوں گا۔ مگر پڑھنے کے بجائے اخبار منہ پر رکھ لیا اور لیٹ گئے، کالم نہ پڑھ سکے۔ یہ دوسری وعدہ خلائی تھی۔ ہر روز صبح نو بجے وہ وقار عظیم صاحب کو فون کرتے تھے۔ بعض باتوں کا فیصلہ کر لینے کے باوجود کبھی ان سے مشورہ کرتے۔ تفصیل بتاتے اور

پوری جزئیات کے ساتھ مسئلے پر بات چیت ہوتی۔ حتیٰ کہ ہم میں سے کسی شخص سے انھیں کام کے سلسلے میں کوئی نکتہ ہوتا تو ہمیں سامنے بٹھالیتے اور وقار صاحب کو سب کچھ بتا دیتے۔ پھر ان کے بارے میں، ان کی صحت کے بارے میں، اپنی صحت کے بارے میں، ان کے کام اور اپنے کاموں کے بارے میں باتیں ہوتیں۔ فون بند کرتے تو مجھ سے کہتے۔ وقار صاحب سے بات کر کے میرا کتنا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ وقار صاحب نہ ہوئے، وٹا منز ہو گئے کہ ان کا فون بھی میرے لیے نقویت کا باعث ہے۔

اگر معمول کے مطابق انھوں نے وقار صاحب کو ۲۲ مارچ کو فون نہیں کیا تو یہ ان کی تیسری وعدہ خلافی تھی۔ جی چاہتا ہے فلاں صاحب سے سوال کروں کہ آپ نے تو کبھی وعدہ خلافی نہ کی تھی۔ ۲۲ مارچ کا دن کیا قیامت کا دن ہے کہ آپ اتنی ساری وعدہ خلافیوں کے مرتکب ہوئے؟

پچھلے دو چار ماہ سے ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ کام بہت زیادہ ہے اور سانس بہت کم ہیں۔ خدا کرے مرے سے پہلے غالب والی کتاب مکمل ہو جائے۔ اسی دوران میں انھوں نے اقبال کے فلسفے پر ایک مقالہ تحریر کرنا شروع کر دیا۔ اس بات سے اضطراب اور بڑھ گیا کہ زندگی تو جتنی بھی تھی اتنی ہی ہوگی، مگر کام بڑھ گیا۔ ان کی شخصیت میں ہزاروں موڑ تھے، مگر جس راستے کی طرف وہ جا رہے تھے اس کا ایک ہی موڑ تھا، اور یہ موڑ ان سے لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اور اب تو وہ اس قریب آتے ہوئے موڑ کو دور سے پہچان رہے تھے۔ وہ اکثر یہ بات کہتے لگے تھے کہ آدمی اپنی موت سے پانچ برس پہلے مرنا شروع ہو جاتا ہے اور میں اس دائرے کا درمیانی حصہ گزر چکا ہوں یہی بات انھیں ہر لمحہ بے چین رکھتی تھی۔

ایک خوف تھا جو ان پر مستط تھا۔ مگر یہ خوف موت کا خوف نہیں تھا۔ وہ اولاد کے سر سے ایک سایہ ہٹ جانے کا خوف بھی نہیں تھا۔ وہ خوف دوستوں سے بچھڑ جانے کا خوف بھی نہیں تھا۔ وہ خوف غالب اور اقبال والے مضامین کے ادھورا رہ جانے کا خوف تھا۔ اس خوف نے ان کے اعصاب میں اس قدر تناؤ پیدا کر دیا تھا کہ ان کاموں کو جلد مکمل کرنے کی کوشش ہی دراصل اس سلسلے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

ہم انھیں ہر آن ہر س منٹ موت سے قریب کر رہے تھے، اور انہی کی وجہ سے وہ زندہ بھی تھے اور ایک ایسی کشمکش تھی کہ بالآخر تکمیل زندگی تو ہو گئی۔

پر کام ادھورے رہ گئے۔

حلقہ ارباب ذوق (ادبی) کے خصوصی تعزیتی اجلاس میں ۲۴ مارچ ۱۹۷۷ء

کو پڑھا گیا

صحبہ لکھنوی کی مقبول کتاب

۱۵/۲۰ روپے

تیجی ایڈیشن ۲۵/۲۰

اقبال اور جھوپال

آنہ طلعت • ڈاکٹر ممتاز حسن • ڈاکٹر محمد طاہر فاروق • شان الحق حقی
آفتاب حسن • ڈاکٹر جمیل جالبی • مشفق خواجہ • خواجہ جمیل الدین شاہد
ڈاکٹر نظیر حسین زیدی • ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی • علاء الدین خالد • حق نواز قیصرانی
محمد مطیع اللہ • ڈاکٹر سید ارشاد نوحی • محمد عنایت اللہ شیخ • بشیر محمود اختر
نواب مشتاق احمد خاں • سید قاسم محمود • بشیر احمد ساجد • سعید اختر درانی
حافظ محمد انور خاں • سعید احمد خاں

تغزیتی خطوط

آنہ طلعت

(کوئٹہ)

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے نبی
تو نے وہ گنج ہائے گراں ما یہ کیا کیے

میری پیاری اتنی جان! السلام علیکم

پرسوں رات کو پیارے ماموں جان کی اچانک وفات حسرت آیات کی قیامت خیز خبر سن کر دل اور دماغ کی جو حالت ہے وہ لکھی نہیں جاتی۔ یہ قیامت خیز خبر سننے ہی دل سے چھین نکل گئیں اور میرے کان یقین نہیں کر رہے تھے کہ یہ منحوس خبر واقعی ہمارے عزیز ترین ماموں جان کے متعلق ہے۔ اس منحوس خبر نے خاندان بھر میں شہر برپا کر دیا ہے ایک قیامت ٹوٹ پڑی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب کی زندگی نے بھی اُن کے ساتھ ہی اپنا سانس روک لیا ہے۔ دل اور دماغ اُن کی موت کی خبر سے مارے غم کے پھٹ رہا ہے اور سمجھ نہیں آرہی کہ اس قلم سے کیا الفاظ نکل رہے ہیں میری انتہائی بدقسمتی ہے جو اس قدر دور ہوں کہ اُن کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکی۔ دل چاہتا ہے کہ اڑ کر آپ سے اور پیاری ماما سے گلے مل کر چیخ چیخ کر اپنے آپ کو ختم کر ڈالوں، مگر میری بدقسمتی ہے کہ یہیں تڑپ رہی ہوں۔ پیارے ماموں جان ہماری تھے۔ ایک ایسی شہیق اور بے مثال ماں جس کی شفقت سے ہم سب کا محروم رہ جانا موت سے بدتر اور قیامت خیز ہے ایک بے مثال سہیلی۔ بے مثال شوہر۔ بے مثال باپ اور بے مثال بھائی تھے۔ افسوس صد افسوس کہ ہم سب نے بجز اور لاچار ہو کر اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے حوالے کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاٰجِعُوْنَ ۝ میرا وجود تو یہاں ہے۔ مگر میرا دل آپ سب میں ہر وقت لگا ہوا ہے اور وہ پیاری ممانی جان جو کسی غیر کی موت کا صدمہ بھی برداشت نہ کر سکتیں، اُن پر یہ قیامت ٹوٹنا بڑی ستم ظریفی ہے۔ اُن کے اور بچا رہے سعید جمیل غلیل اور باقی سب چھوٹے بچوں کے تھے

سے دل غم سے پھٹ رہا ہے۔ وہ بچے جن کو ایک بے مثال اور دالہانہ محبت کرنے والے باپ کی محبت کا فخر حاصل تھا آج ہمیشہ کے لیے بے سہارا ہو گئے۔ آپ کی بد قسمتی پر جنہیں مار مار کر دل روتا ہے جو ایک شفیق ترین بھائی کی بے پناہ محبت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی ہیں۔ آپ دونوں کی محبت بے پایاں تھی اور وہ آپ کو باوجود چھوٹی بہن کے ماں کے برابر درجہ دیتے تھے اور ماں کی طرح جان سے عزیز سمجھتے تھے۔ آپ کی بد قسمتی ہے جو ان کو ہوش و حواس میں آخری بار دیکھ بھی نہ سکیں۔ یہ دل شکن اور جانکاہ غم ایک ایسا دائمی غم ہے جو زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔

غم ہجر اور ہجر دائمی پھر ہجر بھی تیرا

میں صابر ہی سہی پر صبر اتنا ہو نہیں سکتا

دراصل ایسی انمول ہستیوں کا نام اور ان کی یاد کبھی موت مٹا نہیں سکتی۔ وہ اب بھی زندہ ہیں اور ان کی محبت اور ان کی یاد تا قیامت ہمارے دلوں میں زندہ رہے گی۔

آج میں نے اپنی الماری کھولی تو ماموں جان کا وہ خط جو ۱۹ جولائی ۱۹۷۷ء کا لکھا ہوا میرے نام تھا نظر آیا جسے آنکھوں کو لگا کر میں کھوٹ کھوٹ کر روئی۔ یہ خط پچھلے سال جب وہ بیمار ہوئے تھے تو مزاج پر سی کے میرے خط کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا۔ آہ یہ میرے نام ان کا پہلا اور آخری خط تھا جس کے چند الفاظ یوں ہیں۔ ”پچھلے میں کچیس روز سے جو آرام کی زندگی میں گزار رہا ہوں، اس سے مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک بادشاہ ہوں۔ اس غریب مرنے والے کو یہ شاہانہ زندگی بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے جس کے پچھلے چالیس پچاس برس شاقہ محنت کرتے گزرے ہوں۔“ واقعی انھوں نے باوجود کمزور صحت کے اپنے آپ کو انتہائی محنتوں میں مبتلا رکھا۔ ملک و قوم کی خدمت میں انھوں نے قیمتی ترین زندگی بے دھڑک صرف کر دی۔ خدا تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ وہ اس عظیم ترین سستی کو اپنے جوار رحمت میں رکھے اور ان کے لواحقین کو اس صدمہ جان کا وہ کوہ برداشت کرنے کی توفیق دے۔ آمین ثم آمین۔

مجھے اس صدمہ عظیم میں شریک نہ ہو سکے کا انتہائی رنج ہے اور ہمیشہ رہے گا اور مجھے ابھی تک اپنا سنگین جرم اور سنگ دلی لگتی ہے جو میں آپ سب تک نہیں پہنچ سکی، مگر وائے مجبوری۔ کل میں نے باوجود آپ کے منع کرنے کے تمام سامان لاہور جانے کے لیے باندھا اور سفر میں لے جانے کے لیے بچوں کی چیزیں تک رکھ لیں۔ لیکن صبح سویرے لاہور سے ایک فون آگیا کہ آپ نے کہا ہے۔ ”اب تمہارا نا بے مقصد ہے۔ بچوں کو لے کر تنہا اتنا لمبا سفر نہ کرو۔“ میں نے انتہائی شکستہ دلی کے ساتھ اپنے فی الحال جانے کا پروگرام ملتوی کیا ہے۔ خدا مجھے توفیق دے کہ میں ان کے چہلم میں شریک ہو سکوں۔ کرنل صاحب کو بھی ماموں جان کی وفات کا انتہائی صدمہ ہوا ہے۔ پرسوں سے انھیں کی باتیں کر رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے میرے کالوں میں تو ان کے وہی الفاظ گونج رہے ہیں، جو انھوں نے بیگم ردو میں آخری ملاقات پر ہمیں کہا تھا کہ میں اگست میں کوئٹہ آ کر تم لوگوں سے ملوں گا۔

”اے بسا آرزو کہ خاک شدہ“

اچھا امی جان خدا حافظ!۔ خدا ہم سب کو اس صدمہ عظیم کے برداشت کرنے کی ہمت دے اور آپ کا سایہ ہمارے سر پر سلامت رکھے۔ آمین

ڈاکٹر ممتاز حسن

(کراچی)

میری بہن — ابھی ابھی میں نے اتفاقاً گھر پر سیلفون کیا، تو وہ خبر سنی جسے میں جیتے ہی سننا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جب خدا کو کچھ اور منظور ہو۔ تو انسان کیا کر سکتا ہے۔ انسان بہت ہی مجبور ہے۔ بڑا ہی بے بس ہے۔ اس کے دعوے بڑے بڑے ہیں مگر بے بنیاد۔

آج میری بیوی زندہ ہوئیں تو جو صدمہ انھیں ہوتا اس کا میں کچھ ہلکا ہی سا اندازہ کر سکتا ہوں۔ انھیں حمید احمد خاں سے اتنی محبت تھی کہ مجھ سے پوچھے بغیر اپنے اکلوتے لڑکے کا رشتہ آپ کے ہاں کرنے لگیں۔ بعد میں مجھ سے کہا کہ اُن کی توڑکی بے ہی نہیں۔ میں نے کہا مجھ سے پوچھا ہوتا تو میں ہی بتا دیتا۔

یہ خط اپنی طرف سے بھی لکھ رہا ہوں اور اپنی مرحوم بیوی کی طرف سے بھی۔ میں حمید احمد خاں کے برائیوں میں سے تھا۔ آج ان کے سوگواروں میں ہوں، کاش یہ ماتم میری قسمت میں نہ لکھا ہوتا۔

میں نے اس سے پہلے آپ کو کوئی خط نہیں لکھا۔ آج مجبور ہو کر لکھ رہا ہوں۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں میں آپ کے اور بچوں کے کس کام آ سکتا ہوں۔ آپ اس خط کا جواب دینے کی کوشش نہ کریں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ صدمہ کیا چیز ہے۔ البتہ عزیز سعید سے کہہ دیجیے کہ وہ مجھے بالتفصیل لکھیں اپنے اور اپنے بھائیوں کے متعلق۔ لاہور آؤں گا تو حاضر ہوں گا۔ بیوی گئی تو گھر برباد ہو گیا۔ اب حمید احمد خاں گئے تو لاہور میرے لیے خالی ہو گیا۔ کم و بیش پچاس سال کی دوستی اس دنیا میں رہی، خدا جنت نصیب کرے اب کون ہے جو ان سا شریک کا غم گسار دل نواز دوست ہو سکا۔

حمید احمد خاں میرا دوست تھا۔ میرا محسن تھا۔ اس کے احسانات مجھ پر اتنے ہیں کہ میں ان کا کبھی بھی شکریہ ادا نہیں کر سکوں گا۔

میں کرم آباد میں کئی بار ان کا مہمان رہا ہوں، ان کے ساتھ کرکٹ کھیلا ہوں، اب وہاں جاؤں گا تو ان کی قبر نماز پڑھنے — یہ بھی ہونا تھا۔

خدا آپ کو اور بچوں کو صبر دے

ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی

(پشاور)

برادر مکرم — السلام علیکم!

رات اقبال عظیم کے گھر خبریں سن رہا تھا۔ اور خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر ملال کی اطلاع پا کر دل دھک سے ہو گیا۔ بات واضح تھی مگر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کیسا کچھ قلق ہوا ناقابل بیان ہے۔ اب صبح خط لکھتے بیٹھا تو صاحبزادگان میں سے ایک نام بھی یاد نہ آیا۔ گھر کا پتہ البتہ ذہن میں ہے۔ جناب محمود احمد خاں صاحب اور جناب حامد علی خاں صاحب کے دولت کدوں کا پتہ میرے پاس محفوظ نہیں۔ آپ کو ویسے بھی لکھتا۔ مگر اب دوسروں کے حصے کا پیام اور مضمون بھی آپ ہی سے عرض کروں گا۔

لے میاں سعید کا خط جو انھوں نے اس خط کے جواب میں لکھا ہے۔ آئندہ صفحات میں ملاحظہ کیجیے۔ (ص)

موت العالم موت العالم کی مثل خاں صاحب پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ اب ان جیسا جامع انسا کہاں تلاش کیجیے گا۔ علم و فضل کی عظمت اور جاہ و شرف کی بڑائی کے ہوتے ہوئے ایسا انکسار اخلاص اور صمیمیت اب کہاں دیکھنے میں آتی ہے۔ آپ سے تو مرحوم و مغفور کے بے حد خصوصی تعلقات تھے، مگر مجھے بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ میرے اوپر وہ کرم فرماتے تھے جو ہر ایک پر خاص نہ تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کا حسن اخلاق ہر شخص کے ساتھ ایسا تھا کہ وہ انھیں اپنا سمجھنے میں حق بجانب تھا۔

اس وقت بہت سی پرانی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ اردل پر چوٹ لگا رہی ہیں۔ جناب محترم محمود احمد خاں صاحب اور جناب مکرم حامد علی خاں صاحب کو یہ صدمہ بھی دیکھنا پڑا۔ خدا کی مشیت ہے! طبیعت کی یہ شگفتگی اور مزاج کی یہ شستگی اور زبان و ادب کی یہ شینفتگی اب کہاں ملے گی۔ خاں صاحب مرحوم کا حسن اخلاق اور شفقانہ برتاؤ بزرگان سلف کا فقید المثل نمونہ دکھاتا تھا۔ ان کی جدائی عزیزوں کے لیے جس قدر سخت اندوہناک ہے۔ علمی اور ادبی حلقوں کے لیے بھی ویسی ہی دل دوز و جاں گسل ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وقار بھائی! خاں صاحب مرحوم کے اہل خاندان پر جو پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے۔ مگر میں یہی سوچ سوچ کے ہلکان ہوا جا رہا ہوں کہ آپ اس وقت جس عظیم صدمے سے دوچار ہوئے ہیں، خدا کرے آپ میں اس کی برداشت کی ہمت و حوصلہ پیدا ہو۔ رب العزت ہی آپ سب کو اور خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہل عیال کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے گا۔ اور اپنے فضل و کرم سے نوازے گا۔ و ما توفیقی الا باللہ۔

جہاں علم و ادب اور دنیا کے زبان و نقد خاں صاحب مرحوم کا بدل نہیں پیدا کر سکتی، اور یہ ایسا نقصان ہے کہ ملک اور قوم جتنا ماتم کرے کم ہے۔

وما کان قیس ہلکۃ ہلکۃ واحد

والکنۃ بنیان قوم تھد ما

ایسے صاحبان علم و شرف اور جامع اوصاف و کمالات کبھی کبھی پیدا ہوا کرتے ہیں! ہم ان کی جدائی سے انفرادی اور اجتماعی طور پر جس صدمہ عظیم سے دوچار ہوئے، اس کی کسی طرح تلافی ممکن نہیں۔ میں اس اندوہناک قلق و غم میں آپ سب کے ساتھ ہوں۔ ازراہ کرم ڈاکٹر محمود احمد خاں صاحب قبلہ، جناب حامد علی خاں صاحب اور مرحوم کے صاحبزادگان گرامی قدر تک میرا سلام و پیام پہنچا بیئے۔

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

شان الحق حق

(کراچی)

برادر مکرم و محترم حامد علی خاں صاحب! السلام علیکم

ایک مدت کے بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں، کاش کہ اس کے لیے یہ تقریب نامساعد پیدا نہ ہوئی ہوتی، جو قدرت کی ستم ظریفی سے پیدا ہوئی۔ حمید احمد خاں صاحب آپ ہی کے بڑے بھائی نہ تھے۔ میں بھی انھیں ایسا ہی سمجھتا تھا

اور میری طرح اور بہت سے ہوں گے جو ان کی ذات سے ایسی ہی قربت محسوس کرتے ہوں گے اور اس پر فخر بھی۔ ایسے شفیق ایسے وضعیہ ایسے لائق ایسے عمدہ لوگ اب ڈھونڈے نہ ملیں گے۔ ان کی ذات ایک نعمت تھی جو ہمارے ہاتھ سے جاتی رہی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

میری طرف سے اس سانچے پر دلی تعزیت قبول فرمائیں اور دیگر متعلقین کی خدمت میں بھی عرض کر دیں۔ ایک قرارداد تعزیت بھی ملفوف کر رہا ہوں جو آج صبح اس ادارے کے ایک جلسے میں پاس کی گئی۔

آفتاب حسن

(کراچی)

مشفق مکرم حامد علی خاں صاحب: سلام علیک

میں ہنڈی میں تھا کہ ریڈیو میں یہ دل شکن خبر سنی کہ مشفق محترم پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ہم سے جدا ہو گئے۔ میں کیا عرض کروں کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوئی۔ میرا حال اس سپاہی کا ہے کہ جس کے سارے جہول آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہوں اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑے تو کس طرح اور کرے تو کیا۔

میں نے اس ۲۵ سال کے عرصے میں بہت لوگوں کو دیکھا اور آزمایا۔ لیکن پروفیسر صاحب مرحوم کی جیسی شخصیت مجھے ڈھونڈے سے بھی نہیں ملی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں زیادہ کیا کہوں اور کیا لکھوں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ خدامرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے سارے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

(کراچی)

محبت گرامی قدر! سلام مستنون۔

محترمی پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی وفات کی خبر کچھ اس طرح اچانک صبح کو اخباروں میں پڑھی کہ یقین نہیں آیا۔ میں اس خبر سے اس قدر متاثر ہوا کہ آج تین دن سے خط لکھنے کی کوشش کے باوجود خط نہ لکھ سکا۔ حمید احمد خاں صاحب مرحوم کو میں نے آپ کے توسط سے پہچانا اور اس طرح پہچانا کہ میں ان کا عاشق ہو گیا۔ کیسے اچھے آدمی تھے۔ صحیح معنی میں بڑے آدمی۔ خدامرحوم کی مغفرت فرمائے اور فردوس بریں میں درجات بلند عطا فرمائے۔ ان کی وفات سے جو غلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔ نہ معاشرتی دنیا میں اور نہ دل کی دنیا میں۔ یہ خط مجھے ان کے پس ماندگان کو لکھنا چاہیے تھا۔ لیکن ان پس ماندگان میں میں خود بھی شامل ہوں اور آپ کو بھی شامل سمجھتا ہوں۔ خدا آپ کو صبر عطا فرمائے اور مرحوم کے ان کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔ کا حوصلہ بھی جنھیں وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں۔ تہذیب اور تعلیم بھی طباعت کی منزل میں تھی۔ اقبال پر ان کی کتاب بھی چل رہی تھی اور غالب پر بھی۔

اور نہ معلوم کیا کیا وہ چھوڑ گئے ہوں گے۔ اب مجلس کو آپ ہی سنبھال سکتے ہیں۔ خدا کرے ارباب حل و عقد کے ذہن میں یہ بات آجائے۔

امید ہے آپ بعافیت ہوں گے۔ بھابی صاحبہ کی خدمت میں آداب۔

مشفق خواجہ

(کرچی)

محترمی و مکرمی! آداب —

پروفیسر حمید احمد خان کے انتقال کی المناک خبر سنی، یہ حادثہ ایسا غیر متوقع اور اچانک ہے کہ دل کو یقین ہی نہیں آتا۔ افسوس کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے اُس شخص کو بھی چھین لیا جو ہماری تہذیبی و ثقافتی قدروں کا آخری نمایندہ تھا۔ اب ایسے لوگوں کے لیے ہماری آنکھیں ہمیشہ ترستی رہیں گی۔ اُن کی وفات ایک قومی المیہ تو ہے ہی، میرے لیے ذاتی سانحہ بھی ہے، اور آپ کے لیے تو یقیناً ناقابلِ برداشت صدمہ ہے۔ آپ سے جو اُن کے خصوصی تعلقات تھے، باہمی محبت کا جو رشتہ تھا۔ اس کی مثالیں اس زمانے میں کمیاب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعزیت کا خط میں آپ کو لکھ رہا ہوں۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اس صدمے کے جھیلنے کی ہمت عطا فرمائے۔

خواجہ حمید الدین شاہ

محترمہ سلام مسنون۔

میرے کرم فرما پروفیسر حمید احمد خان صاحب کو مرحوم و مغفور لکھتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ رہا ہے، میری آنکھوں میں آنسو ہیں اور میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ رحلت کی اچانک خبر سن کر مجھے بے انتہا دلی صدمہ ہوا کیونکہ میرے دل سے وہ بہت قریب تھے۔ مجھ پر اُن کی جو عنایات بے پایاں تھیں، اب ایک ایک کر کے یاد آرہی ہیں۔ مرحوم کی شرافت اور اپنے ملنے والوں پر شفقت اور محبت کی اس دنیا میں مثال نہیں مل سکتی۔ وہ میرے بے غرض محسن اور ایک بلند مرتبت انسان تھے۔ افسوس پاکستان ایک ایسی عظیم ہستی سے محروم ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس اندوہناک سانحے کا جو صدمہ آپ کو اور آپ کے صاحبزادوں کو ہوا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ ایسا غم ہے جو جھلایا نہیں جاسکتا۔

اللہ پاک آپ کو اور آپ کے صاحبزادوں کو اس غم کے برداشت کرنے کی طاقت اور صبر جمیل کی توفیق بخشے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

میں، میری بیوی اور بچے اس غم میں آپ کے شریک ہیں اور آپ کے لیے درگاہِ الہی میں دست بردار ہیں۔ اللہ بس باقی ہوں۔

ڈاکٹر نظیر حسین زیدی

(کرچی)

عزیز القدر سلمہ! سلام مسنون —

آپ کے والد گرامی پروفیسر حمید احمد خان صاحب کے انتقال پر ملال کا حال معلوم کر کے از حد رنج و افسوس ہوا۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں کہ میں اُن موزوں الفاظ کے ذریعہ اس غم کا اظہار کر سکوں۔ مرحوم و مغفور جن بلند ترین اقدار زندگی کے مالک تھے۔ اُس کا اندازہ دوسرے آدمی زیادہ کر سکتے ہیں۔ مجھے از حد افسوس ہے کہ مجھے مرحوم

سے صرف ایک دفعہ ہی شرف تعارف حاصل ہوا۔ لیکن مرحوم و مغفور نے اپنے اخلاق حمیدہ اور اوصاف جلیلہ کے سبب اس قدر کثیر مصروفیات کے باوجود میری خاطر اتنا وقت دیا کہ جو میرے تصور سے بالا تھا۔ اُن کی پاکیزہ گفتگو، وہ شستہ ادبی مذاق اور انکسار اور شفقت مجھے ساری عمر یاد رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ تقریباً ۲ گھنٹے انھوں نے میرے لیے مخصوص کر دیے اور میں مرحوم کے گفتار ستودہ اور آداب حمیدہ کے باعث اُن کا بے دام غلام بن گیا۔

ہائے ہائے کیسے بلند انسان پیوند زمین ہو گئے۔ جو ہماری زندگی، ہمارے معاشرے اور ہمارے بزرگوں کی پاکیزہ زندگی کا پاکیزہ نمونہ تھے۔

اُن کا مرنا آپ کا اور آپ کی والدہ صاحبہ اور اُن کے اعزہ کا غم نہیں۔ ہم سب کا غم ہے۔ ایسوں کے مرے پر جس قدر انسان روئے اتنا کم ہے۔ میں کس طرح آپ کو صبر کی تلقین کروں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کے اٹھ جانے سے ایک عظیم خلا واقع ہو گیا ہے۔ اور اُن کی جگہ کسی طرح پُر نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ایسوں کے اٹھ جانے پر کیوں نروٹیں لیکن مرضی الہی کے سامنے ہم سب کا تسلیم خم ہے۔ میری جانب سے اپنی والدہ گرامی، اپنے بھائی صاحبان کی خدمت میں یہ چند کلمات تعزیت پیش کر دیں۔ خدا آپ سب کو اس صدمہ کے برداشت کی ہمت عطا کرے۔ اور مرحوم کے درجات بلند کرے۔ میں لاہور آیا تو خود حاضر ہو سکوں گا۔

بہر حال میں آپ سب کے ساتھ اس غم میں شریک ہوں۔ خدا آپ سب کو صبر جمیل عطا کرے۔

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی

(پشاور)

محترمہ — آج کے اخبار میں یہ افسوسناک خبر پڑھ کر بے حد دکھ ہوا کہ میرے مشفق و جہربان پروفیسر حمید احمد خان صاحب اپنے خالق سے جا ملے۔ افسوس صد افسوس۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم سے زیادہ نیک دل، مخلص، ہمدرد اور شریف انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ علمیت و انسانیت کے اس پیکر سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ اپنے غم میں مجھے بھی اور میری بیوی کو بھی شریک جانے۔ خلوص دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور سب بچوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

علاء الدین خالد

(کراچی)

محترمہ: السلام علیکم —

پرسوں اخبارات میں استاذ المکرم جناب حمید احمد خان صاحب کی رحلت سے ناقابل بیان دھچکا لگا۔ مرحوم میرے استاد تھے۔ میں اسلامیہ کالج لاہور میں ۱۹۳۵ء تک ان کا شاگرد رہا۔ اور اُن کی شائستگی، محبت، انسانیت کا پرتو میری زندگی میں اُسی وقت پڑا جسے میں آج بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میں اپنے آپ کو اُن خوش قسمت نہاروں طلبہ میں سے ایک سمجھتا ہوں۔ جن کو اُن کی شفقت حاصل تھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں جو رشتہ قائم ہوا تھا،

وہ تازیست قایم رہا بلکہ اُسے تقویت ہی حاصل ہوئی رہی۔ ان کی پدرانہ محبت سے میں محروم ہو گیا..... اس سے بڑھ کر میری کیا بد نصیبی ہوگی! — انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی رحلت میرا آپ ہی کا نقصان نہیں۔ بلکہ یہ ایک عظیم قوی نقصان ہے ان کی زندگی سے ہزاروں شمعیں روشن تھیں۔ میں خدائے برتر و بزرگ سے رحمت اللعالمین کے صدقے میں دعا گو ہوں کہ وہ انھیں جوار رحمت میں جگہ دے اور ہمیں اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

اُن کی زندگی انسان دوستی کا آئینہ تھی۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چین میں دیدہ و پیدا

میرے لایق کوئی خدمت ہو تو میں اس کی بجا آوری اپنے لیے باعث فخر محسوس کروں گا۔

حق نواز قیصرانی

(بروت - قبائلی علاقہ)

بہ عالی خدمت برادر محترم خاں صاحب سلمہ تعالیٰ! السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

آہ! اپنے استاذ محترم اور محسن و مشفق شخصیت کی تعزیت کے بارے میں کیا لکھوں اور کیسے لکھوں۔ مائے کہ مرحوم کی وفات سے جو دلی صدمہ اور گہرا رنج آپ کو ہوا ہے۔ ہم ہزاروں فرزندِ ان معنوی اس غم و اندوہ میں آپ کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ میرے مرحوم کے ساتھ ۱۹۶۶ء سے نیا زمانہ مراسم تھے۔ میں نے اُن کے سایہ عاطفت میں تعلیم پائی اور مرحوم نے مجھے عملی زندگی میں بھی ہمیشہ یاد رکھا، اُن کے تقریباً دو درجن خطوط میرے پاس محفوظ ہیں اور میرے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔ اُن کا آخری نوازش نامہ ۲۴ فروری ۱۹۷۳ء کا تحریر کردہ ہے۔ اُن کے ہزاروں شاگرد ہی نہیں بلکہ وہ لوگ جنھیں کبھی اُن سے واسطہ پڑا آج اُن کے غمِ فرقت میں اشک بار ہیں۔

صدمہ موج رازِ فتن خود مضطرب کن

موج کہ برکنار رود از میان ما

آپ نے ملک و ملت کے لیے جس خلوص و ایثار کے جذبہ سے کام کیا وہ بے مثل اور دورِ حاضر میں ایک عظیم کارنامہ ہے۔ عملی زندگی کی مجبوریوں کی بنا پر میں حاضر خدمت نہیں ہو سکتا۔ لیکن جوں ہی مجھے وقت ملے گا میں انشاء اللہ ضرور آپ کے ہاں پہنچوں گا اور مرحوم و مغفور کی حمد مبارک پر اصالتاً فاتحہ خوانی کروں گا۔ مرحوم کی شخصیت سے میرا اسٹاف بھی نہایت متاثر تھا اور آج صبح اسکول میں اسٹاف میننگ میں فاتحہ خوانی کر کے مرحوم کو اہصالِ ثواب کیا گیا۔ دل چاہتا تھا کہ مرحوم کی یاد میں ایک طویل تعزیت نامہ لکھ کر غم کا بوجھ ہلکا کیا جائے۔ لیکن ص

بتی ہے وہ دل پہ کہ نہیں تابِ سخن

آہ۔ پرو فیسر حمید احمد خاں صاحب مرحوم۔ "آسمان تیری لحد پر شبنم افشائی کرے۔"

کام تیرا زندہ ہے، نام تیرا باقی ہے

تیرے نام سے روشن ہے محرابِ وطن

ہم یہ "چند دن" والی بات مذاق سمجھتے رہے۔ ہم یوں سمجھنے کا حق بھی تھا۔ ہم زندہ جو تھے۔ لیکن زندہ تو اب بھی تھے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس کے ساتھ وہ سفر کے لیے بھی پوری تیاری کر رہے تھے؟

۳ مارچ کو فیکٹری میں میری صبح کی شفٹ تھی۔ اس شفٹ کے لیے میں صبح پانچ بجے گھر سے نکلتا ہوں اور پہلے تین بجے لوٹتا ہوں۔ حسب معمول میں تین بجے گھر پہنچا تو ابا کو آداب کہنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد ابا میرے پیچھے وہاں آئے اور کہنے لگے کہ آج فائٹ ڈمی بیوی کی سال گرہ ہے۔ تمہاری اسی چاہتی ہیں کہ ایک کیک منگوایا جائے اور بھائی صاحب (حامد علی خاں صاحب) اور تمہاری خالہ یعنی فائٹ کے والدین کو بلا کر اکٹھے چائی پی جائے۔ کچھ دن پہلے انھیں AMERICAN CENTRE کی طرف سے EUGENE O'NEILL

کے ڈرامے LONG DAY'S JOURNEY INTO NIGHT کی فلم دیکھنے کی دعوت ملی تھی، میں نے یہ سوچ کر کہ آج کل دن رات اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، فلم کی تفریح ان کے لیے اچھی ثابت ہوگی، ان پر زور دیا کہ وہ فلم جا کر دیکھیں۔ شاید مجھے اور وقار کو رومیرے چھوٹے بھائی جوان کے ساتھ فلم دیکھنے گئے خوش کرنے کے لیے وہ راضی ہو گئے۔ ان کو پانچ بجے جانا تھا۔ کہنے لگے کہ "مہالوں" کو درادیر میں آنے کے لیے کہنا، تاکہ جب میں سات بجے کے قریب لوٹوں تو میں بھی سال گرہ میں شریک ہو سکوں۔ لیکن امریکن سینٹر میں بات لمبی ہو گئی، اور آبا آٹھ بجے سے کچھ پہلے گھر واپس پہنچ سکے۔ چچا حامد علی خاں صاحب اس سے چند منٹ پہلے اپنے گھر کو روانہ ہو چکے تھے۔ میرے ایک اور خالو اور خالہ صحن میں بیٹھنے لگے۔ ابا بہت خوشی سے وہاں ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ مجھے صبح فیکٹری جانے کے لیے پھر چار بجے اٹھنا تھا۔ اس لیے میں چند منٹ بعد وہاں سے سوئے کی تیاری کے لیے اٹھ گیا۔ اگلے دن صبح دس بجے منصور (میرے چھوٹے بھائی) نے مجھے فیکٹری میں فون کیا، ابا کی طبیعت خراب ہو گئی ہے آپ چھٹی لے کر آسکیں تو آجائیے۔ بارہ بجے کے قریب میں گھر پہنچا تو ابا ہسپتال جا چکے تھے۔ وہاں پہنچا۔ ابا بے ہوش تھے۔ ہم سب سکتے میں تھے۔ دو بج کر پینتیس منٹ پر تین ڈاکٹروں کے ہاتھوں میں اور اپنے بہت سے عزیزوں کی موجودگی میں ابا نے اس مرحلہ کو عبور کر لیا اور اس سفر پر روانہ ہو گئے جس کے لیے وہ تیار تھے۔

۴ مارچ کی صبح کو وہ حسب معمول دفتر جانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ اچانک ایک نئے آئی، غسل خانے دوڑے گئے اور پھر اپنے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ امی اور وقار اور فائٹ فوراً ان کے پاس پہنچے۔ منصور بازار سے لیموں اور سیون اپ لینے دوڑے۔ خود آبا نے اسے معمولی بات سمجھا۔ وقار سے کہنے لگے کہ میں ٹھیک ہی ہوں اور ابھی دفتر چلوں گا۔ ڈاکٹر کو بلائے سے کچھ روکا۔ لیکن نئے کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔

وقار ڈاکٹر کو لینے دوڑے۔ امی سمجھیں کہ صورت خاصی سنگین ہے۔ لیکن آبا نے کوئی خاص بات نہیں کی۔ روہ تو عرصے سے اس کے لیے تیار تھے اور ہمیں بھی تیار کرنے کی کوشش کرتے تھے (بے ہوش ہونے سے چند لمحے پہلے انھوں نے امی کی طرف دیکھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ شاید ہمیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ شاید اس مسکراہٹ میں کچھ مغذرت بھی تھی اور کچھ حسرت بھی۔ پھر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور ہوش کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے۔

چند دن پہلے ابا کو اسلامیہ کالج کے زمانے کے نوجوان دوستوں میں سے ایک صاحب رپرڈ فیئر اختر الدین شعبہ انگریزی، اسلامیہ کالج، لاہور ملنے کے لیے دفتر آئے۔ اختر صاحب بتاتے ہیں کہ ملاقات بہت خوش گوار رہی۔ قہقہے بلند ہوئے۔ لیکن جب انھوں نے ابا سے یہ کہا کہ پرسنل اور وائس چانسلری کے بعد اُن کا موجودہ کام اور دفتر تو گوشہ عافیت ہے تو ابا نے جو جواب دیا، اس پر رپرڈ فیئر اختر الدین اسٹنڈ ہو گئے۔ ابا نے بات سنی تو اُن کے چہرے پر مسکراہٹ کی جگہ بخیدگی نے لی اور کہنے لگے، اختر صاحب، گوشہ عافیت تو قبر ہے اور اس کا اب مجھے انتظار ہے۔ اختر صاحب حیران تھے۔ ابا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، آپ واپس جائیں تو TENNYSON کی نظم *Crossing the Bar* پڑھیے گا۔ یہ نظم میں نے اب پڑھی ہے۔ آپ کے لیے یہاں نقل کر دیتا ہوں۔

Sunset and evening star,
And one clear call for me!
And may there be no moaning of the bar,
When I put out to sea,

But such a tide as moving seems asleep,
Too full for sound and form,
When that which drew from out the boundless
deep,

Turn again home.

Twilight and evening bell,
And after that the dark!
And may there be no sadness of farewell,
When I embark;

For tho' from out our bowene Time and Place
The flood may bear me far,
I hope to see my Pilot face to face
When I have cross't the bar.

سعید احمد خاں

افکار

تقریبی خطوط

ابانے پچھلے چند ماہ میں بعض احباب کو جو خط لکھے ہیں، ان میں سے تین کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں۔ ہم نے ان کو پڑھ کر اس سے ملاقات کا لطف اٹھایا ہے۔

Board for advancement of literature

(Copy)

10.8.1973

My dear Yahya,

I was delighted to receive your letter a couple of days ago. You and the Family Planning Association are doing useful work, and my best wishes are with you. But formal involvement with membership of committees is now over for me. My doctors advise me to spare myself as much as I can. I am now a "weary river" in Swinburne's phrase - a phrase which will come back to your mind in the following famous stanza:

From too much love of living,
From hope and fear set free,
We thank with brief thanksgiving
Whatever gods may be
That no life lives for ever;
That dead men rise up never;
That even the weariest river
Winds somewhere safe to sea.

I am sure you will be good enough to excuse me if I fail to accept the honour of becoming a member of your standing committee. There is a time when one must retire from some of one's former social activity. That time has now come for me. This does not mean, however, that I shall not be at your service whenever you might need my advice informally. All good wishes.

Rana M. Yahya Sahib,
Hony. Secy.
Family Planning Assot. Lahore.

yours Sincerely,
Sd/ Hamid Ahmad Khan.

”۳۳ اکتوبر ۱۹۴۳ء“

برادر - السلام علیکم!

آپ کا ۳۳ اکتوبر کا نوازش نامہ وصول ہوئے دو ہفتے سے زیادہ گزر گئے۔ میں بعد معذرت ”ندیم نمبر“ سے غیر حاضر رہنے پر مجبور ہوں۔ توفیق تو باندازہ ہمت نصیب ہوئی ہے اور ہمت جوانی اور صحت کا عطیہ ہے۔ اس لیے توفیق پر میرا حق بہت کم باقی رہ گیا ہے۔ روزانہ دفتری کام کے بعد ہی سہی سکت اپنی دوزیر طبع کتابوں (اقبال کی شخصیت اور شاعری اور تعلیم و تہذیب) کے پروف دیکھنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے معذور تصور فرمائیں گے۔ تاہم امتثال امر کے طور پر ایک مختصر نثر پارہ ”ندیم نمبر“ کے لیے منسلک ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم پر جو کتاب چھپی وہ مرحوم و معذور کے ادارے (ثقافت اسلامیہ) نے شایع کی تھی۔ میں نے آپ کا کراچی نامہ ان صاحبوں کو بھجوا دیا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ کتاب کی ایک جلد انھوں نے بتاریخ ۶ اکتوبر آپ کی خدمت میں بھیجی تھی۔ امید ہے کہ ”افکار“ میں تبصرہ شایع ہو جائے گا۔ والسلام

خیر طلب

حمید احمد خاں

حضرت صہبا بکھنوی صاحب

مدیر ”افکار“

مکتبہ افکار، رابین روڈ، کراچی

”۲۸ نومبر ۱۹۴۳ء“

برادر مکرم فاطمی صاحب! السلام علیکم

۲۱ نومبر کے نوازش نامے کی رسید ٹیلیفون پر عرض کر چکا ہوں۔ آج غالب (شخص و شاعر) (Ghalib, Man and Poet) کے پہلے دو باب پیش خدمت ہیں۔ حیرت ہے کہ لکھی ہوئی چیزوں کی ترتیب میں اس قدر وقت لگتا ہے۔ بہر حال آپ یہ صفحات اطمینان سے ملاحظہ فرمائیں اور مزید کام کے سلسلے میں اپنی رائے ظاہر فرمادیں تو یہ کام بشرط زندگی جاری رہے گا۔

ایک معذرت ابھی کر دوں۔ دسمبر میں علامہ اقبال کی ولادت کا جشن سدا سالہ منایا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی کے احباب سے مہینوں پہلے وعدہ کر بیٹھا تھا کہ اس مرتبہ سالانہ خطبہ اقبال میں پڑھ دوں گا مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بندری! مطلب یہ کہ دسمبر کا مہینہ اس خطبے کی تیاری کی نذر ہو جائے گا۔ جنوری سے انشاء اللہ غالب کا مسودہ حاضر خدمت ہوتا رہے گا۔ یہ کام اب اس منزل میں ہے کہ جنوری سے اسے بہر حال ادویت حاصل رہے گی۔

والسلام

مخلص

حمید احمد خاں

شاید فروری کے آخر کی ریا مارچ کے شروع کی بات ہے کہ ابا کے نام آپ کا ایک خط آیا۔ خط کیا تھا، فارسی کا شعر تھا، جو آپ نے اپنی چند ہفتے پہلے مرحوم ہونے والی بیوی کو یاد کر کے لکھا تھا۔ ابا نے مجھے وہ دکھایا اور شعر کا ترجمہ کر کے سنایا۔

بہار بود و تو بودی و عشق بود و امید

بہار رفت و تو رفتی و ہر چہ بود گذشت

کہنے لگے بے چارے ممتاز حسن نے یہ لکھا ہے۔ چند دن پہلے اسی طرح کا ایک اور خط "بھی انھوں نے مجھے بھیجا تھا۔ وہ بھی دکھایا۔ جس میں آپ نے یہ شعر لکھے تھے۔ ایک پیلے کے کاغذ پر صرف یہ شعر تھے۔

*I called for madder music + for stronger wine
But when the feast is finished + the lamps expire
Then falls thy shadow, Cynara! the night is thine!*

میں نے اُن سے کہا کہ یہ خط آپ سنبھال لیجیے اور انھوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔ اس واقعہ کے چند دن بعد انھوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ میں تمہیں وہ *Cynara* والی نظم سنانا چاہتا ہوں۔ میں پلنگ پر اُن کے ساتھ بیٹھ گیا اور انھوں نے اپنی *Oxford Book of Modern Verse* کھول کر وہ نظم مجھے اس طرح سنائی جیسے ہی سنا سکتے تھے۔ اُن کی آواز کچھ بھر گئی اور میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ معلوم نہیں اس وقت یوں کیوں ہوا، کہ اب میں نے یہ نظم پھر پڑھی ہے اور میں بچوں کی طرح رویا ہوں:

*Last night, ah, yesternight, betwixt her lips and mine
There fell thy shadow, Cynara! thy breath was shed
Upon my soul between the kisses and the wine;
And I was desolate and sick of an old passion,
Yea, I was desolate and bowed my head;
I have been faithful to thee, Cynara! in my fashion.
All night upon mine heart I felt her warm heart
Night-long within mine arms in love + sleep she lay;
Surely the kisses of her bount red mouth were sweet;
But I was desolate + sick of an old passion,
When I awoke and found the dawn was gray;
I have been faithful to thee, Cynara! in my fashion.*

I have forgot much, Cynara! gone with the wind,

زندہ کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان جرمن فورم لاہور میں اقبال پریسوں کا ایک سلسلہ ہو رہا تھا، جو پورا ہفتہ جاری رہا۔ ابا کو بطور فورم کے صدر کے ہر جلسے میں جانا تھا۔ مجھ سے بھی انھوں نے پوچھا، لیکن دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے میں نے معذرت کی۔ کہنے لگے ٹھیک ہے۔ لیکن ایک دن ممتاز حسن صاحب تقریر کرتے آرہے ہیں۔ اُس دن تم ضرور چلنا۔ وہ تمہیں دیکھ کر خوش ہوں گے۔ سو اُس روز میں بھی گیا، اور آپ کے اور ابا کے ساتھ چند گھنٹے گزارنے کا لطف ایک دفعہ کھراٹھا یا۔ اس قسم کی بات کرنا ابا کی خاصیت تھی۔ وہ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں، اپنے بچوں، عزیزوں اور دوستوں سے شفقت و مروت نہ چھوڑتے تھے۔ ان کے لیے یہ زندگی کی ایک بہت قیمتی چیز تھی۔

اب میں خط ختم کرتا ہوں۔ آپ لاہور آئیں تو ہمیں ضرور اطلاع دیجیے گا۔ والسلام
خاکسار سعید

تغزیتی قراردادیں

(۱)

مجلس ترقی ادب کی منتظمہ کا اجلاس ۲۷ مارچ ۱۹۷۹ء کو مجلس کے دفتر میں صدر مجلس ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اراکین مجلس کے علاوہ جناب عبدالحفیظ کاردار نے بھی شرکت فرمائی۔ ذیل کی قرارداد اس اجلاس میں پیش اور منظور ہوئی:-

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ناظم مجلس ترقی ادب لاہور کی وفات ہماری ملکی اور قومی زندگی کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ مرحوم نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسلام، پاکستان، ادب اور تہذیب کی خدمت میں صرف کیا اور مرتے دم تک کام کو ایک مقدس فریضہ سمجھ کر انجام دیتے رہے۔ مرحوم کی حیثیت پاکستان کے ایک عظیم شہری، ایک سچے اور ہمدرد مسلمان، علمی، ادبی اور تہذیبی زندگی کے لیے ایک مضبوط ستون کی تھی۔ اس ستون کا گر جانا ایک ایسا نقصان ہے جس کا احساس وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہے گا۔ مجلس ترقی ادب کے ناظم کی حیثیت سے انھوں نے پچھلے چند برس میں جو خدمات انجام دیں، ادب اور تہذیب کی زندگی میں ان کا مستقل مقام ہے۔ ان کا کیا ہوا کام اور ان کی دکھائی ہوئی راہ آئندہ نسلوں کے لیے شمع ہدایت کا کام دے گی۔

مجلس ترقی ادب کا یہ اجلاس قوم کے اس عظیم فرزند کی ناگہانی وفات پر اپنے شدید رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی وفات کو قوم اور ملک کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان سمجھتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے عزیزوں اور گواروں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مجلس کے سب اراکین مرحوم کے اعزہ کے غم میں براہر کے شریک ہیں۔

(۲)

۲۶ مارچ ۱۹۶۷ء پنجاب یونیورسٹی اور ٹیٹل کالج کے اساتذہ طلباء و طالبات کا یہ اجتماع پروفیسر حمید احمد خان صاحب کی بے وقت اور ناگہانی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خان صاحب برصغیر پاک و ہند کے علمی، تعلیمی، ادبی اور تحقیقی حلقوں میں نہایت بلند مقام رکھتے تھے۔ غالب اور اقبال پر ان کی تحقیقی اور تنقیدی تحریروں میں سند کا درجہ رکھتی ہیں اور بڑے بڑے محققین اور نقاد ان کا اعتراف دیتے ہیں، مرحوم نے پاکستان کی تعلیمی زندگی میں بھی گراں بہا خدمات انجام دیں، اسلام آباد کالج لاہور کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے انھوں نے ان اداروں میں علم و ادب کو فروغ دیا، اور انسان دوستی، محبت اور دوسری اعلیٰ قدروں کے چراغ روشن کیے۔

پنجاب یونیورسٹی میں انھوں نے مسلمانوں کی تہذیبی اور ادبی تاریخ اور غالب کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ان کی تمام تصانیف کو یونیورسٹی کی طرف سے شائع کرنے کے منصوبے بنائے اور ان کو عملی جامہ پہنایا۔ پاکستانی قوم ان کے اس کارنامے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

خان صاحب کی شخصیت میں مشرقی و مغربی تہذیب و ثقافت کی بہترین روایات پائی جاتی تھیں، وہ انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر تھے لیکن مشرقی زبانوں اور ان کے ادبیات سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ہمیشہ اور ٹیٹل کالج کے معاملات میں گہری دلچسپی لی اور ان کے زمانے میں کالج کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(۳)

پروفیسر حمید احمد خان کے ساتھ ارتحال پر انجمن ترقی اردو کراچی کے صدر اور جملہ اراکین اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں اور دست بردعا ہیں کہ خدائے بزرگ و ہر مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل ارزانی فرمائے۔ آمین

پروفیسر مرحوم دنیا بے ادب میں غیر معمولی شہرت و اہمیت کے حامل تھے اور دورِ حاضر کے روشن خیال اور تجربہ کار کین تصور کیے جاتے تھے۔ کارکنانِ قضا و قدر نے مرحوم کو ان اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں سے نوازا تھا جو ہر موقع و محل پر اپنی عظمت و برتری تسلیم کرا لیتی ہیں۔ ان کے علمی، ادبی اور تعلیمی کارنامے جس طرح زمانہ حال میں دلیل راہ ہیں۔ اسی طرح انشاء اللہ مستقبل میں بھی سمیع ہدایت کا کام دیں گے۔

مرحوم کو زبان اردو کے ساتھ وہاں شیفنگلی تھی اور مدت سے انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کے ساتھ خصوصی روابط رکھتے تھے۔ آج انجمن اپنے ایک مخلص مشیر اور سرگرم کرم فرما سے محروم ہو گئی۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی ملانی بظاہر ممکن نظر نہیں آتی۔ حتیٰ یہ ہے کہ پروفیسر حمید احمد خان کا ساتھ وفات علمی، ادبی اور تعلیمی دنیا کا سنگین المیہ ہے۔

(۴)

جناب حمید احمد خان کے انتقال پر ملال پر اظہار تعزیت کے لیے ترقی اردو بورڈ کراچی کے ارکان اور علماء ادرت کا ایک جلسہ جناب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

”ترقی اردو بورڈ کے ارکان ادرت اور علم کا یہ جلسہ اردو کے ممتاز ادیب و عالم جناب پروفیسر حمید احمد خان کے ناگہانی انتقال پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم ایک بلند پایہ ادیب، محقق، ماہر تعلیم اور ہر دل عزیز استاد تھے۔ وہ ایک سراپا خلوص انسان تھے جن کی شفقت اور انسانیت کا ہر وہ شخص معترف ہوگا جسے ان کی ذات سے کسی عنوان بھی قریب رہا ہو۔ وہ کئی سال تک اس ادارے کے رکن بھی رہے اور اس کی سرگرمیوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے علمی و ادبی کارنامے اردو زبان کا عزیز سرمایہ ہیں اور ان کی یاد ان کے بہت سے دوستوں اور مراعل کے دل میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

حاضرین جلسہ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور ان کے پس ماندگان کے شریک غم ہیں۔“

(۵)

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے ارکان اور کارکنوں کا یہ جلسہ جناب پروفیسر حمید احمد خان سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ساتھ ارحال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

پروفیسر صاحب مرحوم بہت بڑے ماہر تعلیم، محقق اور ادیب تھے۔ تعلیمی اور علمی میدان میں ان کی خدمات عالیہ انتہائی وسیع اور ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے انتقال سے علم و عمل کا ایک بڑا ستون گر گیا۔ اور پاکستان ان کی گراں مایہ شخصیت کے گونا گون فیضان سے محروم ہو گیا۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی خدمات جلیلہ کو شرف قبول عطا کر کے انھیں جنت الفردوس میں مقام رفیع ارزانی فرمائے، اور جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔

(۶)

۵ مارچ ۱۹۷۷ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ کے رفقاء دارکان کا اجلاس پروفیسر محمد سعید شیخ ڈاکٹر ادارہ کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں پروفیسر حمید احمد خان مرحوم کی وفات پر گہرے حزن و ملال کا اظہار کیا گیا اور ان کی مختلف النوع خدمات کی بنا پر ان کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ مرحوم متعدد اوصاف کے حامل اور بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ برصغیر پاک، و ہند کے ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ کامیاب معلم، منجھے ہوئے ادیب اور محتاط مصنف تھے۔ انگریزی، اردو اور فارسی کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے لیکچرر کی حیثیت سے کیا۔ پھر پروفیسر ہوئے۔ چونکہ انتظامی صلاحیتوں سے بھی پوری طرح بہرہ ور تھے، لہذا اس کالج کے پرنسپل مقرر کیے گئے۔ بعد ازاں اپنی خدمات گونا گوں کی بنا پر پنجاب یونیورسٹی کے کئی سال تک وائس چانسلر رہے۔ بعض علمی و تحقیقی نوعیت کے فود کے سربراہ کی حیثیت سے حکومت اور یونیورسٹی کی طرف سے مختلف بیرونی محاکم میں بھی گئے اور اپنے ملک کی نمائندگی کے فرائض انجام دیے۔ کئی

چہیت چہیت

ڈاکٹر ممتاز حسن

اردو زبان کا عاشق

حمید احمد خاں ہمارے زمانے کے چوٹی کے اہل علم میں سے تھے۔ نہ صرف یہ کہ ان کا علم ان کے اکثر ہم عصر علما سے زیادہ تھا، بلکہ ان کی طلب علم ان کے علم سے بھی زیادہ تھی۔

وہ برصغیر ہندوپاک کے ایک سربراہ و درجہ علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی سراج الدین احمد خاں ایک بلند پایہ ادیب اور مصنف تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا ظفر علی خاں نے علم کی نسبت سیاست اور صحافت میں نام پیدا کیا۔ مگر حمید احمد خاں نے سیاست کی کوچہ گردی نہیں کی۔ ساری عمر علم اور تحقیق اور تعلیم اور تعلم سے وابستہ رہے۔ ابتدائی تعلیم وزیر آباد میں ہوئی، جہاں کے مشن اسکول میں گراہم پیلی صاحب ان کے استاد تھے۔ بی۔ اے انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن سے خصوصی امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ انگریزی کا ایم۔ اے پنجاب یونیورسٹی سے اور انگریزی ادب میں ایم۔ لٹ کیمبرج یونیورسٹی سے۔ پہلے پہل انھوں نے پڑانے اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسری کی۔ بعد میں اسلامیہ کالج سول لائٹس میں پرنسپل ہوئے۔ اور اس کالج کو اپنے علمی انہماک اور متانی کردار سے سارے پاکستان کے لیے ایک قابل تقلید ادارہ بنا دیا۔ یہاں سے وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے، انھوں نے اس یونیورسٹی کے لئے فن رٹ کام کیا اور ایک عجیب فرسٹ کلاس لائبریری اور محنت بگائی۔ ہمارے ملک میں جو شخص بھی کام کرے لوگ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ حمید احمد خاں نے بہت زیادہ کام کیا اور معمول سے زیادہ دشمنی مولیٰ لی۔ نتیجہ یہ کہ وقت سے پہلے یونیورسٹی سے دست بردار ہوئے۔ اس کے بعد وہ ادارہ ترقی ادب کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اسی ادارے کے سربراہ تھے۔ جب ۲۲ مارچ ۱۹۷۳ء کو انتقال ہو گیا۔

حمید احمد خاں پاکستان کے بے لوث اور مخلص خادم، غالب اور اقبال کے بلند پایہ ناقد اور مداح اور اردو زبان کے عاشق تھے۔ پاکستان میں ان سے بڑا غالب شناس پیدا نہیں ہوا۔ نہ ہی کسی نے غالب پر اتنا کام کیا۔ یاد و سرور سے اتنا کام لیا۔ پنجاب یونیورسٹی نے ان کے زیر ہدایت اور زیر نگرانی غالب کی صد سالہ برسی پر کتابوں کا ایک سلسلہ شایع کیا۔ خود انھوں نے اس موقع پر نسخہ حمیدیہ کی اس محنت اور جانفشانی سے ترتیب اور تصحیح کی کہ اب یہ نسخہ حمیدیہ حمید احمد خاں ہی کا ہے۔ اقبال سے ذاتی راہ و رسم تھی۔ پاکستان پر جان دیتے تھے۔ اور اردو توان کی زندگی تھی۔ حمید احمد خاں کی تصنیفات جو چھپی ہیں وہ مقابلہ کم ہیں۔ مگر ان کی وہ تحریروں جو ابھی تک چھپی نہیں ہیں۔

ربانی مکتبہ

توصیف احمد

حیدر احمد خاں ہمیں کب اچھے لگے

معروف ماہر تعلیم اور پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں کا انتقال ہو گیا، یوں تو جو بھی اس دنیا میں آیا اسے ایک نہ ایک دن جانا ہے۔ مگر بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ خاں صاحب کا شمار ان ہی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ جنازے میں ہزاروں کا ہجوم تھا۔ کون سی آنکھ تھی جو اشک بار نہ تھی۔ رونے والوں میں ان کے ساتھی، دوست، اور شاگرد بھی شامل تھے۔

خاں صاحب اللہ کو پیارے ہوئے اب تعزیتی جلسے ہو رہے ہیں، مضافین پڑھ جا رہے ہیں جن میں ان کی شخصیت کے پہلو اُٹھا کر کیے جا رہے ہیں۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ خاں صاحب کے بارے میں کیا لکھیں؟ کبھی شاگردی کی سعادت نصیب نہیں ہوئی کہ ان دنوں ہم امتحان دینے اور فیل ہونے کے شغل میں مصروف رہا کرتے تھے، پڑتائیں کر دیتے، جلوس نکالتے دوسرے کالجوں میں تو خیر ہمیں خاصی کامیابی ہوتی، مگر اسلامیہ کالج کے لڑکے ہمارا ساتھ دینے میں ہچکچاتے جب دراز در لگاتے تو جواب ملتا، یار کہتے تو ٹھیک ہو۔ مگر خاں صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ جی ہاں پروفیسر حمید احمد خاں ان دنوں پرنسپل ہوا کرتے تھے اور ہمیں وہ بالکل اچھے نہیں لگتے تھے۔

ظاہر ہے جب یہ لچھن ہوں تو پڑھائی، خاک ہوتی۔ سو کچھ دن آوارہ گردی کی اور پھر ”اخبار نویس“ بن گئے۔ خاں صاحب ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے تھے، ایوب خاں کا دور تھا۔ طلبہ ہنگامے کرتے اور ہمیں رپورٹنگ کرنی پڑتی۔ ہمیں ان دنوں بھی خاں صاحب بالکل اچھے نہیں لگتے تھے۔ ناراضگی کی وجہ یہ تھی کہ پولیس یونیورسٹی کیمپس میں گھس کر لڑکوں کو مارتی ہے اور وہ کیوں خاموش رہتے ہیں؟

پھر ایک دن یہ خبر آئی کہ خاں صاحب نے وائس چانسلری چھوڑ دی۔ بڑا پیرا شوبہ دور تھا۔ نوکرتا ہی کا بڑا دیدہ بہ تھا۔ حالت یہ تھی کہ محکمہ تعلیم کا جوائنٹ سکریٹری وائس چانسلر کو ہدایت دیا کرتا تھا۔ سو کچھ پولیس کی زیادتیاں اور کچھ محکمہ تعلیم کی کارگزاریاں، خاں صاحب زیادہ دن برداشت نہ کر سکے اور خاموشی سے علیحدہ ہو گئے۔ ہمیں جب یہ معلوم ہوا تو پہلی مرتبہ دہڑے اچھے لگے، خدا کا شکر کہ ملک میں ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتے۔

جنوری ۱۹۶۶ء میں ہمیشہ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ منصور نے گھر میں بڑا فساد برپا کیا اور ہماری شادی طے کرادی ہم گھر کے باہر مہمانوں کے استقبال میں مصروف تھے کہ خاں صاحب مع اہلیہ تشریف لائے، بڑی جبرت ہوئی۔ پیار سے ملے۔ پھر وہ احمد ندیم قاسمی اور احمد علی خاں سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ تصویریں کھینچوائیں اور جب جانے لگے تو بڑی اپنائیت سے ہاتھ ہمارے کندھے پر رکھا اور بولے کہ ”توصیف میاں یہ بڑا مقدس رشتہ ہے، ہمیشہ اس کا احترام کرنا۔“

خاں صاحب تو یہ کہہ کر چلے گئے مگر ہم کافی دیر تک کھڑے سوچتے رہے، ان کے اس چھوٹے سے جیسے میں اتنی محبت شفقت اور خلوص تھا کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ ہم خاں صاحب کو نہیں جانتے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ان کا تعلق اس پرلے مکتب فکر سے تھا جس میں استاد اور شاگرد کے درمیان اپنائیت کا ایک نہ لڑنے والا رشتہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو رول نمبر سے نہیں بلکہ نام سے جانتے تھے۔ بعض اوقات ان کی سخت گیری شاگردوں کے لیے باعث تکلیف تھی۔ مگر انھیں ہمیشہ یہ احساس رہتا کہ اس سخت گیر استاد کے پیچھے ایک نہایت مشفق اور رحم دل انسان چھپا ہوا ہے جسے ان کی بہبود کا خیال ہے۔ اور شاید یہی وہ احساس تھا کہ ان کی موت پر ہر شخص سوگوار تھا، جیسے کسی اپنے چلیے سے بچھڑ گئے ہوں۔

تو دوستو پروفیسر حمید احمد خاں کا انتقال ہو گیا، اب جیسے ہو رہے ہیں۔ اس دن پاکستان نیشنل سنٹر میں اسی نوعیت کی محفل تھی، صدارت کے فرائض مرحوم کے شاگرد اور صوبائی وزیر جناب حفیظ کاردار نے انجام دیے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں یہ انکشاف کیا تھا کہ آئندہ تین چار روز کے اندر پروفیسر حمید احمد خاں کو ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا جائے والا تھا۔ مگر ان کی بے وقت موت نے ایسا نہ کرنے دیا۔ ہم نے جناب کاردار کی بات سنی تو کچھ عجیب لگا۔ ان کی زندگی میں ان کے ساتھ کیا کچھ نہ ہوا۔ فیصوں میں کمی کے سلسلے میں انجمن حمایت الاسلام سے اختلاف ہوا تو پرنسپل شب چھوڑی، پھر بیوروکریسی سے اختلاف ہوا تو وائس چانسلری گئی۔ کاش نئی تقرری کا اعلان ان کی زندگی میں ہو جاتا مگر شاید یہ ہماری ”روایات“ کے خلاف ہے۔ ہمیں تو انسان کی خوبیاں اس کے مرنے کے بعد ہی معلوم ہوتی ہیں۔

عمر بھر کرتے رہے سنگ زنی اہل وطن

یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

اردو ادب کی زندہ روایتوں کا علمبردار

مدیر:- اظہر جاوید

فی پروجہ:- ایک روپیہ

تخلیقات

آپ کو دعوت مطالعہ دیتا ہے

ماہنامہ تخلیق-۶- سکلیگن روڈ- لاہور

پروفیسر حمید احمد خاں

دُوظ

صہبیا لکھنوی کے نام

(۱)

لاہور۔ ۱۶ فروری ۱۹۶۳ء

ہمراہ عزیز القدر۔ سلام مسنون!

آپ کی نوازشات و عنایات کی وضع داری کا وہی عالم ہے جو داغ لے کبھی خیال محبوب سے وابستہ کیا تھا سے

کتنا با وضع ہے خیال اُس کا

بے کسی میں بھی آئے جاتا ہے

اس وقت آپ کا ۶۶ جون ۱۹۶۲ء کا گرامی نامہ میرے سامنے ہے۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتا ہوں تو وہ افکار و مقالات جن کی توقع آپ نے مجھے بوجہ حسن ظن قائم کی ہے۔ دور دور تک مفقود محض معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی محبت آمیز توجہ کے جواب میں میرے پاس نذر کرنے کو اگر کچھ ہے تو صرف اپنی ناکردہ کاری کے لیے احساس ندامت۔ احمد ندیم قاسمی میرے کرم فرما میں اور آپ میرے محب گرامی قدر۔ مقام حریت ہے کہ "افکار" کا "ندیم نمبر" مرتب کرنے کا منصوبہ بنائیں اور میں آپ کا ہاتھ نہ بٹاسکوں لیکن میں اب بقدر سمیت ہی احباب کے علمی کارناموں میں حصہ لے سکتا ہوں اور ہمت کا حال پیرہ گیا ہے کہ اپنے لکھے ہوئے متفرقات پاریش کو سیٹھ کی توفیق بھی حسب دل خواہ نصیب نہیں ہو رہی۔

میں ہمیشہ سے کوتاہ قلم آدمی تھا مگر اب جو صورت حال ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ اس خط کے ساتھ ایک برگ سبز (صادقین کی نمائش پر مختصر مضمون جو افکار کے شمارہ اپریل ۱۹۶۳ء میں چھپا ہے) ملفوف کر رہا ہوں جو شاید کسی عام شمارے کے لیے آپ کو اور ناظرین "افکار" کو اس درویش کے سلام محبت کے ساتھ قبول ہو۔

خاکسار حمید احمد خاں

اے اس گرامی نامہ کے بعد میں نے پھر پیغام کے لیے اصرار کیا تو آپ نے ازراہ شفقت "ندیم نمبر" کے لیے پیغام سے نوازدیا جو "ندیم نمبر" میں شامل ہے۔ (ص)

(۲)

مجلس ترقی ادب - لاہور

۳۰ دسمبر ۱۹۷۳ء

برادرِ م السلام علیکم!

ادبی رسائل کی موثر سالانہ کے سلسلے میں گرامی نامہ مورفہ ۱۶ نومبر موصول ہوا، میں اس موثر کے انعقاد کا خیر مقدم کرتا ہوں اور آپ کو اپنی دلی مبارکباد بھجھتا ہوں کہ آپ نے ایک اہم قومی ضرورت کا احساس کر کے اہل علم و ادب اور ارباب حل و عقد کو اس پر متوجہ کرنے کی صورت نکالی۔

پاکستان کی ذہنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جو پاسبان دن رات چوکس کھڑے ہیں اُن میں ہمارے گراں قدر ادبی رسائل بھی ہیں۔ ہمیں داخلی تحفظ کے معاملے میں اُسی طرح دن رات بیدار رہنا ہے جس طرح ملک کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کے لیے ہمارے عساکر صف بستہ کھڑے ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ جن قومی، گونہ نظر نہ آئے والی، سرحدوں کی حفاظت آپ کے سپرد ہے، اُن میں کہیں کوئی رخنہ پیدا نہ ہو اور آپ کی مساعی جمیلہ بیش بہا کامیاب ہوں۔

خاکسار

حمید احمد خاں

(بقیہ اردو زبان کا عاشق صفحہ ۱۶۳ سے آگے)

شاید شدہ تحریروں سے زیادہ ہیں۔ اور ان کی اصل تصنیفات تو ان کے شاگرد ہیں، اور وہ دوست آشنا اور مداحین جنہوں نے اُن کی علمی، تحقیقی اور ثقافتی سرگرمیوں سے الہام لیا۔ اور ان کی زندگی اور کارنامے سے متاثر ہوئے۔

حمید احمد خاں کو حکومت پاکستان نے ستارہ امتیاز اور ستارہ پاکستان کے اعزازات دیے۔ انہوں نے بین الاقوامی کانفرنسوں میں ملک کے ایک آدھ وفد کی قیادت بھی کی۔ مگر کیا ان کے عہدے اور کیا ان کے اعزازات۔ یہ اُن کے لیے باعث عزت نہیں تھے۔ بلکہ ان عہدوں اور ان اعزازات کو ان کی ذات سے عزت اور اہمیت حاصل ہوئی۔ حمید احمد خاں انسانیت کے مجسمے اور اخلاص کے پیلے تھے۔ ان کا جسدِ خاکی سپردِ خاک ہو گیا، مگر وہ نہیں مرے۔ اتنا بڑا انسان موت سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔ وہ زندہ ہیں اور ان کے کارنامے، ان کی سیرت، اُن کی انسانیت سب زندہ ہیں:-

فَتَى عَيْشٍ فِي مَعْرِوْفِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ
كَمَا كَانَتْ بَعْدَ السَّيْلِ مَجْرَاهُ مَرْتَعًا

اچھا ادب - معیاری لائبریری ان کتابوں کے بغیر نامکمل ہے

ناول و افسانہ

- حیدری کی مختلف کہانیاں ڈاکٹر عبادت بریلوی - ۸/-
چاندی کا لکھاؤ کرشن چندر - ۱۲/-
ایک وطن سمندر کے کنارے " " - ۸/-
شُرک واپس جاتی ہے " " - ۹/-
ایک عورت ہزار بولتے " " - ۸/-
ایک خوشبو آڑی آڑی سی " " - ۷/-
دھواں دھواں سویرا انور عظیم - ۱۰/-
تنہا اداس لڑکی سیدہ حنا - ۳/-
اک بوند لہو کی جوگندریال - ۶/-

تنقید و تحقیق

- تنقیدی تجربے ڈاکٹر عبادت بریلوی - ۱۳/-
جدید شاعری " " - ۱۸/-
شاعری اور شاعری کی تنقید " " - ۶/-
مادہ نل کام کنڈلا " " - ۵/-
ہفت گلشن " " - ۵/-
تہذیب و تحریر پروفیسر مجتبیٰ حسین - ۷/-

اسلامیات

- سیرت رسول اللہؐ پروفیسر نواب علی - ۱۸/-
تاریخ صحف سماوی " " - ۸/-
معارف الدین " " - ۷/-

شخصیت، فن، ادب، سفر نامہ

- اقبال اور بھوپال صہبا لکھنوی - ۱۵/-
مشرقی پاکستان " " - ۶/-
مجاز ایک آہنگ (مترتب) " " - ۲/-
جوہلی نمبر " " - ۳/-
جوش نمبر " " - ۲۵/-
حفیظ نمبر " " - ۲۵/-
فیض نمبر " " - ۲۵/-
مصطفیٰ زیدی ایڈیشن " " - ۸/-
حفیظ ہوشیارپوری ایڈیشن " " - ۵/-
سجاد ظہیر ایڈیشن " " - ۶/-

شاعری

- غزل معنی سید آل رضا - ۸/-
نبضِ دوراں پروفیسر شورش علیگ - ۸/-

زیر ترتیب

غالب ایک صدی (مترتب) صہبا لکھنوی
انفرادی خریداروں اور لائبریریوں کے لیے خاص رعایت
کتابوں کی تمام سابقہ قیمتیں کا لعدم تصور کی جائیں۔

مکتبہ افکار
راہن روڈ کراچی - فون ۷۳۹۹۳

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی • طابع ایجوکیشنل پریس کراچی • دفتر راہن روڈ کراچی • کتابت: انوری بیگم دہلوی

فائر ایکسیڈنٹ میرین

اور دیگر متفرق
بیمہ کاری کے لئے


**مکمل
خفّظ**

دی اسٹینڈرڈ انشورنس کمپنی لمیٹڈ

